چند ناسخ ومنسوخ آیات

از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مدراسی ندوی

قرآن مجید کے جو اہم اور معرکۃ الآرا مباحث ہیں ان میں آیات ناسخ ومنسوخ کی بحث کو خاص اہمیت حاصل ہے، سلف سے خلف تک یہ مسئلہ موضوع بحث رہا ہے، اور اس پر مستقل ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، اس موضوع پر بحث کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ استنباط مسائل اور صدور احکام میں اس کی سخت ضرورت پڑتی ہے، چنانچہ مسائلِ فقہ میں اختلاف کے جو بے شمار وجوہ ہیں، ان میں ایک بڑی وجہ آیات ناسخ ومنسوخ بھی ہیں

ناسخ ومنسوخ پر بحث کرنے کے لیے نہ صرف قرآن وحدیث اور تاریخ پر بلکہ تورات وانجیل پر بھی وسیع نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ناسخ ومنسوخ کی اصطلاح اسلامی فقہ کے اندر ایک وسیع معنی میں مستعمل ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی، لیکن سردست اتنا جان لینا چاہیے کہ جس طرح اسلام میں یہ بحث پیدا ہوئی، اسی طرح ان ادیان میں بھی جو اسلام سے پہلے انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے ہیں، اور جن کی شریعتیں ان کے زمانہ کے لوگوں پر واجب تھیں، ان میں بھی ناسخ ومنسوخ کی بحث پیدا ہوئی، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب ان کے احبار و رہبان نے ان کتابوں اور شریعتوں میں تحریف کرنا شروع کر دی تو اس کا مفہوم بھی ان کے ہاں کچھ سے کچھ ہو گیا، اس کا صحیح اندازہ عیسائی مورخین کے ان اعتراضات سے ہوتا ہے جو انھوں نے اسلام پر کیے ہیں، ستم ظریفی یہ کہ انھوں نے اپنے ہاں ناسخ ومنسوخ کا جو غلط مفہوم تھا اسی کو اسلامی

ناسخ ومنسوخ پر بھی چسپاں کر دیا، چنانچہ سر سید احمد خاں تحریر فرماتے ہیں:

گبن (Gibbon) اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے آیات قرآن مجید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، ہر وحی انکی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے، اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول سے کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیل یا ترمیم ہوگئی ہے، دفع ہوگیا ہے۔

سر ولیم میور اپنی "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ نسخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے، مگر مسلمان اس اجتماع ضدین کی تطبیق کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں، تاہم بمجبوری ان کو معترف ہونا پڑا ہے کہ قرآن میں کم سے کم دو سو پچاس آیتیں منسوخ ہیں۔"[1]

موجودہ منکرین حدیث غالباً مستشرقین کے ان ہی اعتراضات سے مرعوب ہو کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ناسخ ومنسوخ کے مباحث صرف احادیث کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، لہذا بہتر یہ ہے کہ احادیث کے اس پورے عظیم الشان ذخیرہ ہی کو ناقابل قبول اور جھوٹ کا پشتارہ قرار دیدیا جائے، ورنہ قرآن پر حرف آتا ہے جس کی مدافعت مشکل ہے، چنانچہ مشہور منکر حدیث مسٹر برق جیلانی لکھتے ہیں کہ

"یہ خرابی (یعنی ناسخ ومنسوخ کی بحثیں) اس لیے پیدا ہوئی کہ امام بخاری اور دیگر ائمۂ حدیث کی نظر ہمیشہ راویوں پر رہی اور یہ نہ دیکھا کہ مضمون روایت کیا تھا اور اس سے کس قدر مفاسد پیدا ہونے کا احتمال تھا، آج اعدائے اسلام یہی احادیث پیش کرکے کہتے ہیں کہ تمھارے قرآن میں رد و بدل ہوتا رہا اور اس کی آیات انسانی دسترس سے محفوظ

---

[1] خطبات احمدیہ مطبوعہ نولکشور سٹیم لاہور ص ۴۴۶

نہیں رہ سکیں کوئی بتاؤ ہم اس الزام کا کیا جواب دیں" (دو اسلام ص ۱۸۰)

اس کے تفصیلی جواب سے قبل یہ پیش نظر رہے کہ قرآن مجید میں آیات ناسخ و منسوخ کی تین قسمیں ہیں، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

والنسخ ثلاثة انواع، احدها ما نسخ حكمه وتلاوته كعشر رضعات، والثاني ما نسخت تلاوته دون حكمه كخمس رضعات وكالشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما، والثالث ما نسخ حكمه وبقيت تلاوته وهذا هو الاكثر ومنه قوله تعالىٰ "الذين يتوفون منكم ويذرون ازواجاً وصية لازواجهم"[1]

نسخ کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ جس کا حکم منسوخ ہوا اور تلاوت بھی منسوخ ہو جیسے رضاعت میں دس گھونٹ کی حدیث، دوسری یہ کہ جس کی تلاوت منسوخ ہو لیکن حکم باقی ہو، جیسے رضاعت میں پانچ گھونٹ کی حدیث اور الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما کہ جو بوڑھا بوڑھی زنا کرے انھیں رجم کردو۔ اور تیسری یہ کہ جس کا حکم باقی نہ ہو لیکن تلاوت باقی ہو اور یہی زیادہ ہیں، جیسے الذین یتوفون کی آیت

اب سوال یہ ہے کہ آخر اس ناسخ و منسوخ کا مطلب کیا ہے۔ کہیں یہ تو نہیں جس کو برقی نے قرآن مجید میں رد و بدل کے نام سے تعبیر کیا ہے، یا عیسائی علماء کی غلط فہمی بقول سرسید احمد خاں مرحوم "عیسائی عالموں نے الفاظ ناسخ و منسوخ کے معنی سمجھنے میں جس کا اطلاق علمائے اسلام نے بطور اصطلاح کے آیات قرآنی پر کیا ہے، بہت بڑی غلطی کی ہے کہ انھوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا، بیکار کر دیا ہے" (خطبات احمدیہ ص ۲۳۶)

[1] شرح مسلم جلد اول ص ۴۶۸ مجتبائی،

اور یا متاخرین فقہاء کا یہ خیال کہ دو صریح متناقض آیتوں میں جن میں کسی قسم کی تطبیق کی گنجایش نہ ہو نسخ کی مجبورانہ ضرورت پیش آئی ہے،

بہرحال اس سلسلہ میں بڑی بحثیں ہیں، امام سیوطی نے فقہائے متاخرین خصوصاً ابن العربی کے قول کے مطابق بیس آیتوں کو اس ذیل میں شمار کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ مانا ہے، لیکن نواب صدیق حسن خانصاحب ایک آیت کے بھی منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں، متقدمین میں بھی ان کا ہمخیال ایک گروہ ہے، چنانچہ علامہ خضری بک مصری لکھتے ہیں:

> علمائے سلف میں جن لوگوں نے قرآن مجید میں کسی آیت کے منسوخ ہونے کا انکار کیا ہے ان میں مفسر اعظم ابو مسلم اصفہانی ہیں، ہم نے ان کے اقوال کو امام رازی کی تفسیر میں دیکھا ہے اور خود امام رازی کی ضمنی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابو مسلم کی اس رائے کی طرف مائل ہیں[1]،

خود علامہ خضری بھی کسی آیت کے منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں،

درحقیقت نسخ ایک اصطلاحی لفظ ہے، متقدمین نے اس سے ہرگز وہ مفہوم مراد نہیں لیا جو متاخرین نے لیا ہے، یا مستشرقین اور منکرین حدیث کے بیان سے مترشح ہوتا ہے، نسخ کے صحیح مفہوم پر علامہ حافظ ابن القیم ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

وان کان نسخا بالمعنی العام الذی	اگر نسخ کے عام معنی مراد ہوں جسکو سلف
یسمیہ السلف نسخا وھو رفع	نسخ کہتے ہیں یعنی کسی تخصیص کی بنا پر ظاہر
الظاھر بتخصیص او تقیید	معنی کو چھوڑ دینا یا مقید کر دینا، یا کسی

---

[1] تاریخ فقہ اسلامی ص ۳۰

وشرط او مانع فهذا اكثر من السلف يسميه نسخا فان اردتم هذا المعنى فلا مشاحة في الاسم ولكن ذلك لا يسوغ رد السنن الناسخة للقرآن بهذا المعنى بل هو متفق عليه بين الناس وانما تنازعوا في جواز نسخه بالسنة النسخ الخاص الذي هو رفع اهل الحكم. وجملته بحيث يبقى بمنزلة ما لم يشرع البتة

شرط کی بنا پر ترک کر دینا یا کسی مانع کی وجہ سے، پس سلف میں سے زیادہ تر لوگ اس کو نسخ کہتے ہیں، اگر تم نسخ کے یہی معنی مراد لو تو اس نام میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس سے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ احادیث جو اس معنی میں قرآنی آیات کی ناسخ ہیں رد کر دیں یا انھیں ٹھکرا دیں، یہ تو لوگوں میں متفق علیہ ہے، اگر اختلاف ہے تو صرف اس بات میں کہ اس نسخ خاص کو جائز قرار دیں جس سے اصل حکم ہی کو ترک یا قرآن کو مجموعی طور سے انکار کر دینا اس طرح ثابت ہو کہ وہ غیر تشریعی حکم میں آجائے،

تخصیص کے معنی یہ ہیں کہ پہلی عبارت کے عموم کو محدود کر دیا جائے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالمطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُومِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا

مطلقہ عورتیں حیض کا انتظار کریں جب تم نے مسلمان عورتوں سے نکاح کر کے پھر ہاتھ لگانے سے قبل اس کو طلاق دیدو تو تمھارے لیے ان کے اوپر کوئی عدت نہیں ہے، جس کا تم شمار کرو،

ان دونوں آیتوں میں پہلی آیت عام ہے، جو مدخولہ اور غیر مدخولہ دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہے لیکن دوسری آیت میں غیر مدخولہ عورتوں کے لیے خاص حکم ہے،

اور تقیید کے معنی یہ ہیں کہ کسی آیت کے اطلاق کو مقید کر دیا جائے مثلاً

۱؎ اعلام الموقعین

حرمت علیکم المیتۃ والدم — تم پر مردار اور خون حرام کیا گیا۔

پھر دوسری آیت میں فرمایا:

قل لا اجد فیما اوحی الی محرما — کہہ میری طرف جو وحی کی گئی ہے اس میں کوئی

علی طاعم یطعمہ الا ان یکون — حرام چیز جس کو کوئی کھانے والا کھائے بجز

میتۃ او دما مسفوحاً — مردار اور بہنے والے خون کے نہیں پایا،

ان دونوں آیتوں میں پہلی آیت حرام خون کے لیے مطلق ہے، لیکن دوسری آیت میں مسفوح یعنی بہنے کی قید لگائی ہے،

کسی شرط کی بنا پر پہلی آیت کی عبارت منسوخ مان لی گئی ہو، مثلاً

اذا ناجیتم الرسول فقدموا — اے ایمان والو جب تم رسول سے سرگوشی کرنے کا

بین یدی نجواکم صدقات — ارادہ کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے مساکین کو

ذلک خیر لکم واطھر فان لم — کچھ خیرات دیدیا کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور گناہوں

تجدوا فان اللہ غفور رحیم ۵ — سے پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے پھر اگر تم کو مقدور نہ ہو

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ استطاعت کی شرط ہے، ورنہ معاف ہے۔

کسی مانع کی وجہ سے منسوخ کر دینا، اس کی مثال آیت میراث اور وصیت ہے، میراث کا حکم کسی کمی بیشی کے ساتھ پچھلے ادیان میں رہا ہے، لیکن اوائل اسلام میں خصوصاً ابتدائی مدنی زندگی میں ہجرت، ترک وطن اور بھائی بندوں اور بال بچوں کی قربانی کی وجہ سے جب کسی کا کوئی منظم خاندان نہ رہا تو وصیت کا حکم دیا گیا، لیکن بعد میں جب پھر خاندان منظم ہو گیا اور بال بچے بھی ہو گئے تو یہ رکاوٹ باقی نہ رہی اور میراث کا حکم وصیت کی جگہ کر دیا گیا،

حافظ ابن القیمؒ کے قول ولکن ذالک لا یسوغ رد السنن ..... الخ کے معنی یہ ہیں کہ

نسخ کا اگر یہ مطلب مراد لیا جائے تو حدیث آحاد بھی قرآنی آیات کے لیے ناسخ بن سکتی ہیں، لیکن امام موصوف نے لکھا ہے کہ نسخ کے اس معنی کا کہ اصل حکم ہی کو رد کر دیا جائے کوئی ثبوت نہیں، اور نہ یہ بات قابل قبول ہے،

ان سب اقوال کے ضمن میں نسخ کی جو قسمیں آتی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں، ایک یہ کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں، دوسرے صرف حکم منسوخ ہو اور تلاوت باقی ہو، ان دونوں میں زیادہ تر دوسری قسم پر بحثیں ہوئی ہیں، الفوز الکبیر اور تاریخ تشریع الاسلامی وغیرہ کتابوں میں بھی اسی صورت پر بحث کی گئی ہے، لیکن اس مضمون میں دونوں قسموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے،

منکرین حدیث سب سے پہلے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا البتۃ الخ کی آیت پر اعتراض کرتے ہیں، چنانچہ مسٹر برق جیلانی لکھتے ہیں:

"ہمارا ایمان ہے کہ الٰہی پیغام کا ہر لفظ محفوظ ہے، لیکن بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ چند آیات پہلے قرآن میں موجود تھیں لیکن بعد میں نکال دی گئیں، مثلاً

لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ کتبتھا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما فانا قد قرأناھا	اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطاب نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں یہ آیت اس میں شامل کر دیتا الشیخ والشیخۃ ... کہ جب بوڑھا اور بوڑھی زنا کے مرتکب ہوں تو انھیں سنگسار کر دو،

ہم یہ آیت قرآن میں پڑھتے رہے، لیکن اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے؟ اگر نکال دی گئی تو اللہ کا وعدۂ حفاظت قرآن کیا ہوا؟ اس موضوع پر بخاری میں ایک حدیث موجود ہے

عن عمر بن الخطاب قال ان اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم وانزل علیہ	عمر بن الخطاب فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور ان پر ایک کتاب نازل کی

الکتاب فکان فیما انزل اٰیۃ الرجم جس میں آیت رجم بھی موجود تھی،

یعنی امام بخاری نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ قرآن میں آیت موجود تھی، لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ گئی کہاں؟ (رد اسلام ص ۱۶۹)

اس مسئلہ میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے لفظ کتاب اللہ بہت قابل غور ہے، ساری پیچیدگی اسی کو ٹھیک نہ سمجھنے کی بنا پر ہوتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حیثیتیں ہیں:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

صحابۂ کرام کو قرآنی آیتیں پڑھکر سناتے ہیں، ان کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتے ہیں

صحابۂ کرام کو ان تینوں چیزوں کا فرق معلوم تھا، وہ یہ جانتے تھے کہ رسول پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ رسول کی ہر بات کو صحیح اور برحق مانیں اور اس پر صدق دل سے ایمان لائیں، بلاشبہ قرآنی آیات منزل من اللہ ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ان کی تشریحات بھی حکماً قرآن ہی کی طرح قابل اتباع اور قابل عمل ہیں، اس کا ثبوت حضرت ابن مسعودؓ کی اس حدیث سے ہوتا ہے کہ

وعن عبد اللہ بن مسعود قال لعن اللہ الواشمات والمتوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المتغیرات خلق اللہ فجاءتہ امرأۃ فقالت انہ بلغنی انک لعنت کیت وکیت فقال مالی لا العن من لعن رسول اللہ

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے گودنے والی اور گودنے کی خواہش کرنے والیوں پر، پیشانی کے بال اکھاڑنے والیوں پر اور دانتوں کو مزین اور کشادہ بنانے والیوں پر جو اللہ کی بنائی ہوئی ہیئت کو بدلنا چاہتی ہیں ایک عورت نے آکر کہا میں نے سنا ہے آپ نے یہ باتیں کہی ہیں، آپ نے جواب دیا میں کیوں لعنت

صلی اللہ علیہ وسلم ومن ھو فی
"کتاب اللہ" فقالت لقد قرأت
ما بین اللوحین فما وجدت
فیہ ما تقول قال لئن کنت
قرأتیہ لقد وجدتیہ اما
قرأت ما آتکم الرسول فخذوہ
وما نھاکم عنہ فانتھوا" قالت
بلی قال فانہ قد نھی عنہ"
متفق علیہ[1]

بھیجوں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر
لعنت بھیجی ہے اور یہ بات کتاب اللہ میں موجود ہے،
اس عورت نے کہا دونوں دفتیوں کے درمیان
جو کچھ ہے میں نے بھی اسے پڑھا ہے لیکن یہ بات
کہیں نہیں ملی، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا
اگر واقعی تم اس کو پڑھے ہوتیں تو ضرور
پاتیں، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا ہے کہ رسول
تمھارے پاس جو کچھ لائے اسے اختیار کرلو
اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ،
عورت نے کہا ہاں یہ پڑھا ہے حضرت ابن مسعودؓ
نے فرمایا تو پس اس سے رسول اللہ نے منع کیا ہے

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے،

ان عثمان بن عفان جلس علی
المقاعد فجاء الموذن فاذنہ
بصلوٰۃ العصر فدعا بماء
فتوضأ ثم قال واللہ لاحدثکم
حدیثا لولا انہ آیۃ فی کتاب
اللہ ما حدثتکموہ ثم قال
سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عثمان بن عفانؓ ایک جگہ بیٹھے تھے کہ
اتنے میں موذن آیا، آپ نے اسے نماز عصر کی اذان
دینے کا حکم دیا، پھر پانی منگوایا اور وضو کیا
اسکے بعد فرمایا خدا کی قسم تم سے ایک حدیث
بیان کروں گا، اگر وہ کتاب اللہ کی ایک آیت
نہ ہوتی تو ہرگز بیان نہ کرتا، پھر فرمایا میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہوئے سنا کہ

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۸۱

یقول ما من امرء یتوضأ فیحسن	جو شخص بھی وضو کرتا ہے اور عمدہ طریقہ سے کرتا ہے
وضوءہ ثم یصلی الصلوٰۃ الا غفر	پھر نماز پڑھتا ہے تو اس نماز اور اسکے بعد کی
لہ ما بینہ و بین الصلوٰۃ الاخری	دوسری نماز تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یہاں تک
حتی یصلیھا[1]	کہ اس کو پڑھ لے ،

اس حدیث میں ما من امرء ..... کی حدیث کو قرآنی آیت اسی لیے کہا کہ حضورؐ کا قول اور ارشاد بھی حکم کے اعتبار سے کتاب اللہ ہی کی طرح ہے ،

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب اللہ سے صحابۂ کرام صرف کلام مجید ہی کو نہیں مراد لیتے تھے بلکہ حضورؐ کے ارشادات کو بھی کبھی کبھی اس نام سے موسوم کرتے تھے۔

تورات و انجیل کے احکام و آیات بھی کتاب اللہ کے نام سے موسوم ہیں ، اسلام نے تورات و انجیل کے سلسلہ میں بڑی رواداری برتی ہے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں تورات و انجیل کو پڑھنے سے منع کر دیا تھا لیکن بعد میں اسکی اجازت دیدی اور فرمایا[2]

حدثوا عن بنی اسرائیل ولا	بنو اسرائیل سے روایت کرو اسمیں کوئی حرج نہیں
حرج لا تصدقوھم ولا تکذبوھم	مگر نہ اس کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب ،

جن معاملات کے متعلق وحی نہیں ہوتی تھی ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسری کتب سماوی اور اگلی شریعتوں کے احکام پر عمل فرماتے تھے ، اور دوسروں کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے ، حدیث میں آتا ہے ،

وعن عباس قال کان النبی صلی اللہ	حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم یحب موافقۃ اھل	علیہ وسلم ان امور میں جن کے بارہ میں وحی نہیں

---

[1] موطا ص ۱۰ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۶

الکتاب فیما لم یؤمر فیه، وکان اهل الکتاب یسدلون اشعارهم وکان المشرکون یفرقون رؤسهم فسدل النبی صلی اللہ علیه وسلم ناصیته ثم فرق بعد ذالک متفق علیه (مشکوٰۃ ص ۳۸۰)

نازل ہوئی تھی، اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے، چنانچہ اہل کتاب سر کے بال سیدھے لٹکایا کرتے تھے، اور مشرکین مانگ نکالتے تھے، آپ بھی پہلے (اہل کتاب کی موافقت میں) بال لٹکاتے تھے لیکن پھر بعد میں مانگ نکالنے لگے،

اسی طرح دین ابراہیمی کے بہت سے احکام کو جو عربوں میں رائج تھے، اسلام نے اپنے اندر سمو لیا تھا، مثلاً طلاق، حج میں تلبیہ، نماز جنازہ وغیرہ احکام ہیں، درحقیقت دین ابراہیمی کی باقیات میں جن کو اسلام نے قبول کر لیا تھا[1]، اس کی وجہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ یہ فرماتے ہیں کہ

واعلم ان النبوۃ کثیرا ما تکون من تحت الملۃ کما قال اللہ تعالیٰ ملۃ ابیکم ابراھیم وسر ذالک انه تنشأ قرون کثیرۃ علی الدین یدین وعلی تعظیم شعائرہ تصیر احکامه من المشهورات الذائعۃ اللاحقۃ بالبدیھیات الاولیۃ التی لا تکاد تنکر فتجئ بنبوۃ اُخری لاقامۃ ما اعوج منها و

جاننا چاہیے کہ نبوت کسی ملت کے تحت میں ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمھارے باپ ابراہیم کی ملت، اس کا راز یہ ہے کہ جب کسی دین کی پیروی اور دینی شعائر کی تعظیم میں کئی صدیاں گذر جاتی ہیں تو اس کے احکام اتنے مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ بدیہیات اولیہ بن جاتے ہیں، جن کا انکار ممکن نہیں رہتا، اس کے بعد جب دوسری نبوت آتی ہے تاکہ اس کی بگڑی ہوئی صورت کو بنائے،

[1] کتاب المحبر لابن حبیب ص ۳۰۹

وصلح ما فسد منها بعد اختلاط روایة بینها فتفتش عن الاحکام المشهورة عندهم فما کان صحیحا موافقا لقواعد السیاسة الملیة لا تغیره بل تدعو الیه وتحث علیه وما کان سقیما قد دخل التحریف فانها تغیره بقدر الحاجة وما کان حریا ان یزاد فانها تزیده علی ما کان عندهم وکثیرا ما استدل هذا النبی فی مطالبه بما بقی عندهم من الشریعة الاولی فیقال عند ذالک هذا النبی فی ملة فلان النبی او من شیعته وکثیرا ما تختلف النبوات لاختلاف الملل لناز تلک النبوة فیها[1]

اس کی خرابی کی اصلاح کرے . . . . ان کے مشہور احکام کی تحقیق کرتا ہے اور اس کا جو حصہ صحیح اور اس کی ملی سیاست کے قواعد کے موافق ہوتا ہے اس میں کوئی تغیر نہیں کرتا ہے، بلکہ اپنی ملت کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے، اور اس کے قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اور جو سقیم ہوتا ہے، اور اس میں تحریف واقع ہوتی ہے ان میں بقدر حاجت تغیر کر دیتا ہے اور جس میں اضافہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں اضافہ کر دیتا ہے، اور بسا اوقات یہ نبی اپنے مطلب کی باتوں کا استدلال شریعت اولیٰ کی باقی ماندہ چیزوں سے کرتا ہے، ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے کہ یہ نبی فلاں نبی کی ملت یا اسکے گروہ سے ہے،

کتب سماوی کے وہ احکام جنھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تین قسم کے ہیں:

ایک وہ احکام اور آیات جن پر پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرمایا کرتے تھے، لیکن بعد میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ

ان کی جگہ قرآن نے دوسرے احکام بیان کر دیے اور اہل کتاب کے احکام کو منسوخ کر دیا، جیسے یوم عاشورہ کے بجائے رمضان کا روزہ فرض ہو گیا، پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، بعد میں کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا، اور جب اہل کتاب معترض ہوئے کہ حضور، ان کے مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو قرآن نے جواب دیا،

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ	ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو
بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا	کوئی اس سے بہتر یا اسکی مثل دوسری آیت لے آتے ہیں،

اس آیت کی تفسیر میں علامہ جصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے

لا نسخ فی شریعۃ نبینا محمد	متاخرین فقہا میں سے بعض نے کہا ہو کہ محمد
صلی اللہ علیہ وسلم وان ماذکر	صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں کوئی نسخ
فیھا من النسخ فانما المراد بہ	نہیں ہوا اور جس نسخ کا ذکر ہو اس سے مراد
نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین	صرف پچھلے انبیاء کے احکام ہی کا نسخ ہے،

جصاص کا قول لا نسخ ..... سے اس نسخ کی نفی مراد ہے جسے عام طور پر فقہا نسخ کہتے ہیں، جس میں اوپر کی مذکورہ تینوں قسمیں شامل ہیں، اس آیت کے سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے اس اعتراض کے جواب میں نازل ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تورات و انجیل پر عمل کر کے پھر اس کو بدل دیتے ہیں،

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ کتب سابقہ کے آیات و احکام کو قرآن نے بھی ظاہر کیا، مثلاً

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ	اور ہم نے ان (اہل کتاب) پر یہ فرض کیا تھا
وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ	کہ جان کا بدلہ جان ہو اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا
وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ	ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت اور

وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدہ ۔ ۴۷)

زخموں میں قصاص ہے، پس اگر کوئی اسے معاف کردے تو وہ اسکی طرف سے کفارہ ہوجائے گا، اور جو شخص اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے موافق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

تورات میں یہ آیت اسی طرح ہے

توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، جیسا ہی کسی کا نقصان کرے اس سے ویسا ہی کیا جاوے۔ (احبار باب ۲۴ - ۲۰)

قرآن نے پہلے اس حکم کو فرض نہیں بلکہ صرف ظاہر کردیا، لیکن پھر بعد میں ایک دوسری آیت کے ذریعہ اس کو مسلمانوں پر بھی فرض کردیا، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ أَلِيمٌ

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے میں آزاد اور غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت، ہاں اس کا بھائی (فریق) اس کو کچھ معاف کردے تو مطالبہ معقول اور نرم طریقہ پر کرنا چاہیے اور مطالبہ کو اس فریق کے پاس خوبی سے پہنچا دینا چاہیے، یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے، سو جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کریگا اس کے لیے آخرت میں عذاب دردناک ہے،

(۳) نسخ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کتب سماوی کے جن احکام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہو اور اسلامی احکام میں شامل کر لیا ہو لیکن ان کا ذکر قرآن میں نہ ہو بلکہ یا اس وحی کے ذریعہ آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہو، جو وقتی طور پر حضرت جبرئیلؑ آپ کے پاس لاتے تھے، اور اس کا قرآنی وحی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، یا الہام کے ذریعہ یا خود حضورؐ نے فہم نبوت سے اس کو اختیار کر لیا ہو یا اجتہاد کیا ہو، چونکہ حضور کے دیے ہوئے احکام بھی بمنزلہ کتاب اللہ ہیں، اس لیے اسی نام سے موسوم ہوئے،

حضور کا اجتہاد اور آپ کی رائے بھی تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے یہ بھی کتاب اللہ کی طرح ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں[1]:

عن ابن شهاب ان عمر بن	حضرت ابن شہاب سے مروی ہے کہ عمرؓ
الخطاب رضی اللہ عنہ قال	ابن خطاب نے فرمایا جبکہ وہ منبر پر تھے،
وھو علی المنبر یا ایھا الناس	اے لوگو! رائے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ان الرای انما کان من رسول	کی صحیح تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو بتلاتا
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا	اور رہنمائی کرتا تھا اور ہماری رائے
ان اللہ کان یریہ وانما ھو منا	تو بس گمان اور تکلف ہی ہے،
الظن والتکلف،	

گویا حضرت عمرؓ کا قول اس آیت کی تفسیر ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	بیشک ہم نے آپ پر اس لیے کتاب اتاری
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ	حق کے ساتھ تاکہ اللہ نے جس طرح بتایا ہو اسکے
اللّٰهُ	مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دو،

---

[1] اعلام الموقعین ص ۶۱

کیا اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ فیصلے جن کو لتحکم بین الناس سے تعبیر کیا ہے وہ قرآنی احکام و آیات کے علاوہ ہیں اور ان ہی کو سنن یا احادیث کہتے ہیں، اور صحابہ اپنے زمانہ میں ان کو بمنزلہ کتاب اللہ اور لفظ کتاب اللہ سے بھی تعبیر کرتے تھے،

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ کی حدیث کو بھی اسی تیسری قسم کی کتب سماوی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، اس سلسلہ میں ذیل کی حدیث خاص طور پر قابل لحاظ ہے:

وعن عبد اللہ بن عمر ان الیہود جاؤا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہ ان رجلا منہم وامرأۃ زنیا۔ فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شان الرجم۔ قال نفضحھم ویجلدون۔ قال عبد اللہ بن سلام کذبتم ان فیھا الرجم فاتوا بالتوراۃ فنشروھا فوضع احدھم یدہ علی آیۃ الرجم فقرأ ماقبلھا ومابعدھا فقال عبد اللہ بن سلام ارفع یدیک۔ فرفع فاذا فیھا آیۃ الرجم۔ فقالوا

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ ان کے یہاں ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، اس کا کیا حکم ہے، آپ نے فرمایا: رجم کے بارے میں تمھاری کتاب میں کیا حکم ہے، انھوں نے جواب دیا، ہم ایسے لوگوں کو رسوا کرتے ہیں، کوڑے لگاتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے عرض کیا، تم جھوٹ بولتے ہو، اس میں آیت رجم موجود ہے، چنانچہ وہ لوگ تورات لے آئے اور اس کو کھولا، ایک شخص نے رجم کی آیت کو ہاتھ سے چھپا لیا اور اس سے پہلے اور بعد کی آیت کو پڑھنے لگا، عبد اللہ بن سلامؓ نے فرمایا ہاتھ اٹھاؤ، اس نے ہاتھ اٹھایا تو دیکھا کہ آیت رجم موجود ہے،

صدق عبد الله بن سلام يا محمد فيها آية الرجم فامر بهما النبي صلى الله عليه وسلم فرجما وفي رواية قال ارفع يدك فرفع فاذا فيها آية الرجم تلوح فقال يا محمد ان فيها آية الرجم ولكنا نتكاتمه بيننا، فامر .... متفق عليه ....

ان لوگوں نے کہا اے محمد عبداللہ بن سلامؓ نے سچ کہا تھا، آیت رجم موجود ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے مطابق فیصلہ کیا اور دونوں رجم کر دیے گئے، ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا ہاتھ اٹھاؤ، جب ہاتھ اٹھایا تو دیکھا کہ آیت رجم بالکل عیاں ہے، اس وقت یہودیوں نے کہا اے محمد اس میں آیت رجم موجود ہے لیکن ہم لوگ اسکو چھپاتے تھے، چنانچہ آپ نے دونوں (زانی اور زانیہ) کو رجم کا حکم دیا اور وہ دونوں رجم کر دیے گئے،

ابن عمرؓ کی اس روایت میں بعض پہلو سوچنے کے ہیں، اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توراۃ میں آیت رجم کن الفاظ میں تھی؟ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے پڑھ کر سنایا گیا تو کیا وہ حضورؐ اور دوسرے صحابہ کو یاد نہ ہوگئی ہوگی؟ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں توراۃ پڑھنے سے صحابہ کو روکا تھا، پھر اس کی اجازت دیدی تھی، حضرت عمرؓ، ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ توراۃ بھی پڑھا کرتے تھے، کیا ان کی نظر سے یہ آیت نہ گذری ہوگی اور ان کو یاد نہ رہی ہوگی؟ اور کیا عام صحابہ اس سے بے خبر رہے ہوں گے؟ جبکہ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال كان اهل الكتاب يقرؤن

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب توراۃ عبرانی زبان میں پڑھتے تھے، اور

التوراة بالعبرانية ويفسرونها لأهل الاسلام بالعربية فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا آمنا بالذی انزل الینا وانزل الیکم والهنا والهکم واحد

(الفصل فی الملل والنحل ج ۱ ص ۲۱۶)

اور اس کی تفسیر مسلمانوں کے لیے عربی زبان میں کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل کتاب کی باتوں کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب بلکہ یہ کہو کہ جو کچھ ہمارے لیے اور تمہارے لیے نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے۔

اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة یہی وہ آیت ہے جس کو یہود چھپاتے تھے، اور اسی کو عام طور پر قرآنی آیت سمجھا جاتا ہے اور حضرت عمرؓ کا جو یہ قول

۱؎ تورات و انجیل کی آیات میں اخذ و تحصیل کی اسی رواداری کا نتیجہ ہے کہ بعد میں قرآنی آیات کی تفسیروں میں تورات و انجیل کی وہ چیزیں بھی شامل ہوگئیں جو اسلامی نہیں تھیں، مگر کسی حد تک قرآنی واقعات کی موید کہی جاسکتی تھیں، اس عام رواداری کا اندازہ اس حدیث سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ

عن ابی هریرة انه قال خرجت الی الطور فلقیت کعب الاحبار فجلست معه فحدثنی عن التوراة وحدثته عن النبی صلی الله علیه وسلم (موطا امام مالک ص ۳۸)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں میں ایک مرتبہ طور کی طرف گیا تو کعب بن احبار سے ملاقات ہوئی میں ان کے پاس بیٹھ گیا، انھوں نے مجھ سے تورات کی روایت کی اور میں نے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی۔

اس کے بعد یہ حال ہوا کہ ان اسرائیلیات کا بڑا حصہ حدیث میں آگیا، چنانچہ موضوع احادیث کا ایک حصہ ان ہی روایات پر مشتمل ہے، مفسرین نے خاص طور سے ان روایات کو جگہ دی جس کا اندازہ طبری اور ابن کثیر کی روایات سے کیا جاسکتا ہے۔

اوپر گزرا ہے کہ "الرجم فی کتاب اللہ حق" اس سے مراد تورات یا کتاب بمعنی قانون شرعی ہے، جیسا کہ اوپر حضرت ابن مسعودؓ کے قول اور دوسرے اقوال میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ بعض ارشادات رسول کو بھی صحابۂ کرام حکماً قرآن مجید کی طرح سمجھتے تھے اور اسی نام سے موسوم کرتے تھے، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے:

عن ابی ھریرۃ وزید بن خالد	ابوہریرہؓ اور زید بن خالد روایت کرتے ہیں کہ
ان رجلین اختصما الی رسول اللہ	دو شخصوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک
صلی اللہ علیہ وسلم فقال احدھما	مقدمہ پیش کیا، ایک نے کہا یا رسول اللہ کتاب اللہ
اقض بیننا بکتاب اللہ وائذن لی	کے مطابق ہمارا فیصلہ کیجئے، اور مجھے کچھ کہنے کی
ان اتکلم، قال تکلم، قال ان	اجازت دیجئے، حضور نے فرمایا جو کچھ کہنا چاہتے ہو
ابنی کان عسیفا علی ھذا فزنی	کہو، اس نے کہا یا رسول اللہ میرا لڑکا اس (حکم)
بامرأتہ فاخبرونی علی ابنی الرجم	سے ناواقف تھا اور اس شخص کی بیوی سے زنا
فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وبجاریۃ	کرلیا، لوگوں نے کہا کہ میرے لڑکے پر رجم ہے، میں نے
لی ثم انی سألت اھل العلم فاخبرونی	اس کی طرف سے ایک سو بکریاں اور ایک باندی فدیہ
ان علی ابنی جلد مائۃ وتغریب	میں دیدی، پھر میں نے اہل علم سے پوچھا انھوں نے
عام وانما الرجم علی امرأتہ، فقال	کہا لڑکے کو ایک سو کوڑے لگائے جائیں گے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما	اور اس کو ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائیگا
والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما	اور رجم صرف عورت پر ہے، رسول اللہ نے
بکتاب اللہ، اما غنمک وجاریتک	فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے
فرد علیک واما ابنک فعلیہ جلد	میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ
مائۃ وتغریب عام واما انت	کرونگا، بکریاں اور لونڈی تمھیں لوٹائی جائیں گی

یا انیس فاغد الی امرأۃ ھذہ	اور تمھارے لڑکے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے
فان اعترفت فارجمھا فاعترفت	اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائیگا، اور تم
فرجمھا	انیس اس عورت کے پاس جاؤ، اگر اس نے
....	اعتراف کر لیا تو اس کو رجم کر دو، اس عورت نے
(متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۳۰۹)	اعتراف کر لیا اور اس کو رجم کر دیا گیا،

اس حدیث میں اما غنمک وجاریتک الخ واما ابنک فعلیک الخ اور واما انیس الخ یہ تینوں فیصلے قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، مگر اس کو کتاب اللہ کا فیصلہ بتایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ "کتاب اللہ" صحابہ کے دور میں "قانون شرعی" کے لیے اصطلاح تھی۔

اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ کا قول الرجم فی کتاب اللہ حق سے مراد یہ ہے کہ قانون شرعی کے مطابق رجم ثابت شدہ حکم ہے، اور وہ آیت الشیخ والشیخۃ الخ ہے جس کو توراتی آیت کہنا چاہیے کیونکہ وہ تورات کی اصل آیت کا عربی ترجمہ ہے۔

(باقی)

رحمت عالم

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وسلم کی مشہور و مقبول تصنیف جو مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی، اب نہایت اہتمام سے دوبارہ چھاپی گئی ہے۔

قیمت :- ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے

یہ کتاب پاکستان میں مکتبہ الشرق آرام باغ کراچی سے بھی مل سکتی ہے۔

"منیجر"

چند ناسخ و منسوخ آیات

از جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب [illegible] ندوی

(۲)

اس اجمال کی تفصیل اب بیان کی جاتی ہے، سب سے پہلے جس حدیث کو مصنف برہان نے ادھورا نقل کیا ہے ہم اس کو پورا نقل کرتے ہیں جس سے حقیقت کھل جائے گی،

فخطب (عمر بن الخطاب) الناس	حضرت عمرؓ نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا
ثم قال ايها الناس قد سنت	اے لوگو تمہارے لیے سنت بنائی گئی ہے اور
لكم السنن وفرضت لكم الفرائض	فرائض فرض کیے گئے ہیں اور تم کھلی روشنی میں
وتركتم على الواضحة الا ان	چھوڑے گئے ہو، خبردار لوگوں کے ذریعہ
لا تضلوا بالناس يمينا وشمالا	دائیں بائیں گمراہ نہ ہو جانا، اپنے ایک ہاتھ
وضرب باحدى يديه على	کو دوسرے ہاتھ پر مارا اور کہا، ہوشیار!
الاخرى ثم قال اياكم ان تهلكوا	آیت رجم کے سلسلہ میں ہلاک نہ ہو جانا
عن آية الرجم ان يقول قائل	کہ کوئی کہنے والا یہ کہے کہ کتاب اللہ
لا نجد حدين في كتاب الله	میں دو حدیں (کوڑا اور سنگساری) نہیں
فقد رجم رسول الله صلى الله	ہیں، بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم
عليه وسلم ورجمنا ولولا ان يقول لنا	نے رجم کیا اور ہم لوگوں نے بھی، اگر لوگ
زاد عمر في كتاب الله لكتبتها	یہ نہ کہتے کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ فانا قد قرأناھا

ترجمہ: الشیخ والشیخۃ .... الخ کو کتاب اللہ میں لکھ دیتا اسلئے کہ ہم نے اس کو پڑھا ہے۔

(موطا مالک، ص ۳۴۹)

اگر پچھلی گفتگو ملحوظ نہ رکھی جائے تو واقعی اس حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ الشیخ والشیخۃ .... الخ قرآن کی آیت تھی اور حضرت عمرؓ اسی آیت کو قرآن میں شامل کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اہل سنت علماء آج تک یہ مانتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن میں ایسی آیتیں تھیں جنھیں قرآن سے خارج کردیا گیا، مگر ان کا حکم باقی رکھا گیا ہے، اسی طرح ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا حکم بھی آیت کی طرح منسوخ ہوگیا، اسی بنا پر مذکورہ آیت کو بڑی شد و مد کے ساتھ منسوخ بالتلاوۃ اور باقی بالحکم سمجھتے ہیں، اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ خبر خلفاً عن سلف آج تک اسی طرح چلی آرہی ہے لیکن جب مستشرقین نے اسلام پر اس کے ذریعہ یہ حملہ کیا کہ قرآن مجید معاذ اللہ ایک ناقص کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے، اسی لیے اس میں انسانی کلام کی طرح رد و بدل اور کانٹ چھانٹ ہوئی، اس وقت ہمارے علماء کو تنبہ ہوا اور انھوں نے اس سلسلہ میں مختلف تاویلیں شروع کیں، غالباً سب سے پہلے سر سید احمد خاں کو اسکی مدافعت کرنی پڑی، انھوں نے اس کو تو تسلیم کر لیا کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ آیات ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ناسخ و منسوخ ایک خاص اصطلاح ہے جو عیسائیوں کی اصطلاح سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے، ان کے ہاں ناسخ و منسوخ کے معنی یہ ہیں جیسا کہ رودزنڈ مسٹر ہارن کا بیان ہے دو یا زائد قرأتوں میں صرف ایک ہی قرأت صحیح ہو سکتی ہے، اور باقی کاتب کی تحریفات یا غلطیاں ہونگی، یہی فاضل اس کے اسباب بھی بیان کرتا ہے کہ

(۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) منقول عنہ میں سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا،

(۳) کاتبوں کا بدون کسی کافی سند کے متن کی عبارت کی اصلاح کی خواہش کرنا،

(۴) قصداً تحریفات کرنا جو کسی فریق کے حصول مدعا کے واسطے کی گئی ہو۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۴۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اختلاف قرأت یا نسخ و منسوخ سے مراد وہ تمام تحریفات اور تبدیلیاں ہیں جو ان کے احبار و رہبان نے من مانی خواہشات کی بنا پر کی ہیں، سرسید یہ کہتے ہیں کہ اس معنی میں قرآن میں ناسخ و منسوخ بالکل نہیں ہے، اور نہ ناسخ و منسوخ کو اسلاف کی ایک اصطلاح قرار دیتے ہیں، لیکن الشیخ والشیخۃ ...... الخ کی آیت کو قرآنی آیت تسلیم نہیں کرتے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی تدوین قرآن میں اس کے قرآنی آیت ہونے کا انکار کیا ہے، اور بڑی وضاحت سے اس آیت میں بلاغت کی خامیاں دکھائی ہیں، اور بتایا ہے کہ کسی حال میں یہ قرآنی آیت نہیں ہو سکتی بعض محققین کا یہ قول بھی ہے کہ اس قسم کی حدیثیں صحیحین میں نہیں ہیں بلکہ نسائی اور حاکم میں ہیں، جن کے رجال میں بڑی کمزوری ہے، اس لیے ان حدیثوں کو نہ ماننا ہی بہتر ہے لیکن یہ جوابات تشفی بخش نہیں ہیں، اگرچہ یہ روایتیں صحیحین میں نہیں بلکہ حاکم اور نسائی کی ہیں، لیکن موطا کی جو روایت اوپر نقل کی گئی وہ بہت ہی معتبر سند سے مروی ہے، اس کی سند یہ ہے

(قال) مالك عن يحيى بن سعيد عن سعيد بن المسيب قال لما صدر عمر بن الخطاب من منى اناخ الابطح ..... الخ

اس سند میں تو کلام نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ موطا امام مالک کو بہت سے علماء اصح الکتاب بعد کتاب اللہ مانتے ہیں، ایسی حالت میں اس کی روایت بھی حجت میں مسلم کی روایت سے کم نہیں ہے، حاکم، نسائی وغیرہ کی روایت میں اس آیت کے ساتھ بعض الفاظ زیادہ ہیں، یعنی الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ" اس سے زیادہ ان الفاظ پر کلام ہو سکتا ہے اور اس کے زائد ٹکڑے کو نکالا جا سکتا ہے، مگر مطلق قرآنی آیت ہونے سے انکار سمجھ میں نہیں آتا، ورنہ جو حدیث یحییٰ بن سعید اور سعید بن المسیب سے مروی ہے، اس کا کیا جواب دیا جائیگا

حضرت عمرؓ کی موطا کی روایت کے بعض الفاظ پر غور کرنے سے بات بڑی حد تک صاف ہو جاتی ہے،

حضرت عمرؓ کے اس قول والرجم فی کتاب اللہ حق سے کیا مراد ہے، اس بارے میں علماء میں اختلاف ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ

اى فى قوله تعالى "او يجعل الله لهن سبيلا" فبين النبى صلى الله عليه وسلم ان المراد به رجم الثيب وجلد البكر كما تقدم التنبيه عليه فى قصة العسيف قريبا (فتح البارى ج ۱۲ ص ۱۲۱)

اللہ تعالیٰ کے اس قول کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا کے معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس سے مراد رجم اور غیر محصن کے لیے کوڑے ہیں جیسا کہ اوپر عسیف کے قصہ میں گذر چکا ہے۔

امام عینی فرماتے ہیں۔

قوله والرجم فى كتاب الله حق اى فى قوله تعالى "او يجعل الله لهن سبيلا" وبين النبى صلى الله عليه وسلم ان المراد به رجم الثيب وجلد البكر (شرح بخاری للعینی ج ۱۱ ص ۱۶۰)

حضرت عمرؓ کے اس قول کا کہ "رجم کتاب اللہ کی رو سے برحق ہے" اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس قول "یا ان کیلئے اللہ کوئی سبیل پیدا کردیگا" کی طرف ہے جس کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ اس آیت سے مراد ثیب کے لیے رجم اور غیر محصن کے لیے کوڑے لگانا ہے،

بخاری میں اسی بحث کے ضمن میں حضرت عمرؓ کی یہ حدیث مروی ہے،

الا ثم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تطرونى كما اطرى

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری ایسی تعریف نہ کرو جیسی عیسیٰ بن مریم کی کی گئی

عیسی بن مریم وقولوا عبد الله ورسوله. ثم انه بلغنی ان قائلا منکم یقول والله لو مات عمر بایعت فلانا فلا یغترن امرؤ ان یقول انما کانت بیعة ابی بکر فلتة وتمت الا وانها قد کانت کذلک ولکن الله وقی شرها

بلکہ مجھکو صرف اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو (قول عمر) مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر عمر مرجائے تو میں فلاں کی بیعت کروں گا، ہم لوگوں کو ہر اس دھوکے میں مبتلا نہ رہنا چاہیے کہ ابوبکر کی بیعت اتفاقی چیز ہے، مگر کامیاب ہوگئی، اگر ایسا تھا بھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ شر سے بچالیا،

اس کی شرح میں ابن حجر فرماتے ہیں:

ومناسبة ایراد عمر قصة الرجم والزجر عن الرغبة عن الآباء للقصة التی خطب بسببها وهی قول القائل لو مات عمر لبایعت فلانا. انه اشار بقصة الرجم الی زجر من یقول لا اعمل فی الاحکام الشرعیة الا بما وجدته فی القرآن ولیس فی القرآن تصریح باشتراط التشاور اذا مات الخلیفة

رجم اور اپنے آباء سے انحراف پر ملامت کے واقعہ، اس واقعہ کے ساتھ بیان کرنا جس کے لیے خطبہ دیا، یعنی کہنے والے کا یہ کہنا کہ "اگر عمر مرجائے تو فلاں سے بیعت کروں گا" ان دونوں واقعوں میں یہ مناسبت ہے کہ حضرت عمرؓ نے قصہ رجم کے ذریعہ اس شخص کو تنبیہ کی ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں اس احکام شرعیہ پر عمل کروں گا جو قرآن میں ہوں گے، قرآن میں تو خلیفہ کی موت پر مشورہ کی بھی کوئی تصریح نہیں ہے، بلکہ وہ

بل انما یوخذ ذلک من جهة	سنت کے ذریعہ اخذ کی گئی ہے، جیسے آیت رجم
السنة کما ان الرجم لیس فیما	تلاوت کیجانے والی آیتوں میں سے نہیں
یتلی من القرآن وھو ماخوذ من	ہے بلکہ سنت رسول سے ماخوذ ہے۔
طریق السنة (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۳۱)	

اس سے معلوم ہوا کہ رجم کی آیت موطا میں بسند صحیح روایت ہونے کے باوجود عینی اور ابن حجر جیسے اکابر یہ کہتے ہیں کہ رجم کا حکم الشیخ والشیخة..... الخ کی آیت سے ثابت نہیں بلکہ سنت رسول یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد سے ثابت ہوتا ہے،

عینی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں،

قولہ انزل اللہ ای باعتبار	ان کے قول انزل اللہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ
ما کان الشیخ والشیخة فارجموھما	حکم قرآن سے منسوخ شدہ آیت الشیخ
من القرآن نسخت تلاوته	والشیخة..... کے مطابق ہے یا اس بات
اوباعتبار انه ما ینطق عن	کی بنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
الھوی ان ھو الا وحی یوحی	ہوائے نفس سے کچھ نہیں کہتے ہیں جو کچھ کہتے
(شرح بخاری عینی ج ۱۱ ص ۱۶۰)	ہیں وہ وحی کے ذریعہ کہتے ہیں۔

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے قول والرجم فی کتاب اللہ کے بارہ میں علماء کی تین رائیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے الشیخ والشیخة کی آیت مراد ہے، دوسری یہ کہ حضورؐ نے آیۂ قرآنی او یجعل اللہ لھن سبیلا سے اجتہاد کرکے اس کو اخذ کیا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فہم نبوت سے رجم کا حکم فرمایا ہے،

اوپر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ یہود نے آیت رجم چھپانے کی کوشش کی ہے جو ظاہر ہوگئی، اس سلسلہ میں بعض اور روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہود نے جس آیت کو چھپایا تھا اسکی حضورؐ کو خبر ہوگئی تھی، وہ اس طرح کہ جب یہود نے زانی اور زانیہ کے بارے میں حضورؐ سے حکم پوچھا تو اس وقت آپ کو اس کا علم نہیں تھا، اللہ نے اس موقع پر جبرئیل کے ذریعہ آپ کو یہ اطلاع دیدی کہ اسکا حکم توراۃ میں اصلی حالت میں موجود ہے، اور انھوں نے اس میں تحریف کرکے نیا حکم گھڑ لیا ہے، چنانچہ ابن العربی طبرانی سے روایت کرتے ہیں کہ

وکان رجل وامرأۃ من اشراف اھل خیبر زنیا واسم المرأۃ بسرۃ وکانت خیبر حینئذ احرباً فقال لھما اسئلوہ۔ فنزل جبرئیل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال اجعل بینک وبینھم ابن صوریا (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۴۸)	شرفائے اہل خیبر میں سے ایک مرد اور عورت نے زنا کیا، عورت کا نام بسرہ تھا، خیبر میں ان دنوں لڑائی جاری تھی، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کے بارے میں کہا گیا، اس وقت جبرئیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے اور ان لوگوں کے درمیان ابن صوریا کو ثالث بنالیں

معالم التنزیل میں کچھ اور تفصیل ہے،

ونزل جبرئیل بالرجم فاخبرھم بذلک فابوا ان یاخذوا بہ فقال لہ جبرئیل اجعل بینک وبینھم ابن صوریا ووصفہ لہ	جبرئیل رجم کی آیت لیکر نازل ہوئے، آنحضرت نے یہود کو اس حکم کی اطلاع دی، ان لوگوں نے اسکے ماننے سے انکار کردیا، جبرئیل نے کہا کہ آپ اپنے اور ان کے درمیان ابن توریا کو ثالث بنالیں اور آپ سے اس کا وصف بیان کردیا،

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کی خدمت میں یہ مقدمہ پیش ہوا تو جبرئیل نے آپ کو اصل حکم بتادیا جو تورات میں تھا، جب یہود نے اس حکم کو نہ مانا تو جبرئیل نے فیصلہ کے لیے ابن صوریا جیسے عالم کو ثالث بنانے کا مشورہ دیا، جب یہود اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے تو تورات منگوائی گئی، یہود نے اس میں سے رجم کی آیت کو چھپانے کی کوشش کی مگر عبد اللہ بن سلام نے اس سے آگاہ کردیا،

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم وحی کے حکم سے دیا تھا، یا توراۃ کی آیت کے مطابق؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ وحی اور آیت توراۃ دونوں ایک ہی ہیں، اس لیے کہ جبرئیل ہی نے اس آیت کی اطلاع دی تھی، جو تورات میں اصلی حالت میں موجود تھی، اس لیے حضور کا یہ حکم وحی بھی تھا اور آیت توراۃ بھی، وما ینطق عن الھویٰ کے مطابق آپ کے اجتہاد کا نام وحی خفی ہے، جو قرآن کے علاوہ وحی کی ایک قسم ہے، اس لیے یہ حکم توراۃ سے بھی ثابت ہے اور وحی خفی سے بھی، اس لحاظ سے رجم کو کتاب اللہ کہنا بالکل صحیح ہے، اور واقعی وہ ان دونوں حیثیتوں سے کتاب اللہ میں شامل ہے،

اس کی تائید علامہ ابن حجر کے قول سے بھی ہوتی ہے، فرماتے ہیں،

فسمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلامهم ولم یحکم فیهم الا مستندا لما اطلعه اللہ تعالیٰ فحکم فی ذلک بالوحی. (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۵۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا مقدمہ سنا اور آپ نے جو فیصلہ فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع کی سند پر فرمایا یعنی وحی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کا فیصلہ وحی کے مطابق تھا، اور وحی توراتی حکم یا آیت تھی، اس لیے دونوں ایک ہی ہے، دو مختلف چیزیں نہیں، سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رجم کا حکم دیتے وقت آپ نے یہ بھی فرمایا:

فانا اول من احیا کتاب اللہ و عمل بہ، ثم رجما (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۵۰ طبع جدید مصری)	میں پہلا شخص ہوں جس نے کتاب اللہ کو زندہ کیا اور اس پر عمل کیا، پھر وہ دونوں رجم کر دیے گئے،

جس حکم کو ابن حجر نے جبرئیل کی اطلاع اور وحی قرار دیا ہے، اسی کو ابن ہشام کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کا مردہ حکم یا تحریف شدہ آیت فرمایا، جس کو آپ نے زندہ کیا،

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، یہ کہ حضورؐ نے اس کے بعد مسلمانوں پر اس حکم کا جو اجراء فرمایا، اس کی کیا نوعیت ہے، آیا وہ وحی کے مطابق تھی یا توراتی آیت کے بموجب، علماء کا کہنا ہے کہ اسی وحی اور آیت کا حکم مسلمانوں کے لیے بھی ہے، چنانچہ عینی تحریر فرماتے ہیں،

وان شرع من قبلنا یلزمنا مالم ینقض اللہ بالانکار، واحتج بہ الشافعی واحمد، وان الاسلام لیس بشرط الاحصان وقالت المالکیۃ واکثر الحنفیۃ انہ شرط واجابوا عن حدیث انما رجمهما بحکم التوراۃ ولیس ھو من حکم الاسلام فی شئ	ہم سے پہلے کی شریعت جب تک اللہ تعالیٰ اس کا انکار نہ کرے ان پر عمل ہمارے لیے لازمی ہے، امام شافعی اور احمد اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ اسلام میں احصان کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ یہ توراۃ سے ماخوذ ہے) مالکی اور اکثر حنفی یہ کہتے ہیں کہ احصان (اسلام میں رجم) کی شرط ہے) اور حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو توراۃ کے حکم کے مطابق ہی رجم کیا، اور یہ حکم اسلام میں (توراۃ کے علاوہ

(شرح بخاری ج ۱۱ ص ۱۴۷) علٰحدہ) نہیں ہے یعنی توراۃ ہی کا حکم اسلام کا حکم ہے۔

امام ابن حجرؒ بھی یہی فرماتے ہیں:۔

وکان ذالک اول دخول النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وکان ماموراً باتباع حکم التوراۃ والعمل بھا حتی ینسخ ذالک فی شرعہ۔ فرجم الیھود علی ذالک الحکم (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۵۳)

یہ (رجم کا واقعہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے کی ابتدا کا ہے، اس وقت آپ کو توراۃ کی اتباع اور اس پر عمل کرنے کا حکم تھا یہاں تک کہ اس کو آپ کی شریعت نے منسوخ کر دیا، یہودیوں کا رجم اسی حکم پر مبنی تھا،

ابن حزمؒ کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

واما استشھاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالتوراۃ فی امر رجم الزانی المحصن وضرب بن سلام یدا ابن صوریا اذ جعلھا علی آیۃ الرجم فحق (الفصل فی الملل والنحل ج ۱ ص ۲۱۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محصن کے رجم کیلئے آیتِ توراۃ سے استدلال کرنا، اور ابن سلام کا صوریا کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا جب اس نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ لیا تھا، بالکل حق بات ہے۔[1]

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ یہودی زانی اور زانیہ اور مسلمان زانی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رجم کیا وہ دراصل توراۃ کی غیر محرف آیت رجم کے مطابق تھا، جس کی تصدیق آپ کے فہم نبوت

---

[1] اسی حقیقت کو پیش نظر رکھکر علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

واستدل بہ علی ان شرع من قبلنا شرع لنا اذا ثبت ذالک لنا بدلیل قرآن

اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ہماری شریعت سے پہلے کی شریعت کے احکام جب وہ قرآن

یعنی وحی خفی نے بھی کر دی، ان تینوں کو ایک لفظ میں ادا کرنے کے لیے اگر کوئی لفظ مناسب تھا تو وہ "کتاب اللہ" کی اصطلاح ہے، حضرت عمرؓ کا اس موقع پر "والرجم فی کتاب اللہ حق" کہنے کا مطلب دراصل اسی وسیع معنی میں تھا، اس لفظ سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی جامع لفظ نہیں ہو سکتا۔

مگر اس کے بعد بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضورؐ نے توراۃ کی آیت پر بحکم وحی عمل کا حکم فرمایا تب بھی موطا کی روایت میں حضرت عمرؓ کے اس قول کے کیا معنی ہیں کہ رجم کی آیت الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ قرآن مجید کی (منسوخ بالتلاوۃ) آیت ہے، اور اس منسوخ بالتلاوۃ آیت کے مطابق ہی حضورؐ نے رجم کا حکم دیا" اس بنا پر حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا کہ اگر لوگوں کے اس کہنے کا خوف نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں زیادتی کر دی تو میں ضرور قرآن میں اس آیت کو بڑھا دیتا،

محدثین کرام نے حضرت عمرؓ کے قول "والرجم فی کتاب اللہ حق" کی تو مختلف توجیہات کیں لیکن آپ کے اس قول کا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی منسوخ التلاوۃ آیت کا کوئی ایسا تشفی بخش جواب نہیں دیا جس سے اشکال رفع ہو جائے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۸) وحدیث صحیح مالم یثبت نسخہ بنص یعۃ بیننا وبینھم او شریعتھم وعلیٰ ھذا فیحمل ما وقع فی ھذا ھذہ القصۃ علیٰ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم علم ان ھذا الحکم لم ینسخ من التوراۃ اصلا۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۵۳)

و حدیث کی دلیل سے ثابت ہوں، اور ہماری شریعت یا ان کے انبیاء کی شریعت سے انکو منسوخ نہ ہو، ہمارے لیے بھی شرعی حکم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بنا پر اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ حکم توراۃ سے ہرگز منسوخ نہیں ہوا،

اس کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تورات کی جس آیت کو یہودیوں نے چھپایا تھا، اس کا مضمون اور عربی ترجمہ کیا تھا، علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ووقع بیان ما فی التوراۃ من	توراۃ کی آیت رجم کے بارہ میں ابوہریرۃؓ کی
آیۃ الرجم فی روایۃ ابی ھریرۃ	ایک روایت کا بیان ہے کہ اگر محصن اور
المحصن والمحصنۃ اذا زنیا	محصنہ زنا کریں اور ان کے خلاف جرم
فقامت علیھما البینۃ رجما	ثابت ہو جائے تو وہ دونوں رجم کیے جائیں گے
وان کانت المرأۃ حبلی تربص	اگر عورت حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک انتظار
بھا حتی تضع ما فی بطنھا	کیا جائے گا،

ایک دوسری روایت میں آیت توراۃ کا مضمون یہ بتایا گیا ہے،

وفی جابر عند ابی داؤد قالا نجد	ابوداؤد کے نزدیک جابرؓ کی حدیث میں
فی التوراۃ اذا شھد اربعۃ	یہ ہے کہ ہم توراۃ میں یہ (مضمون) پاتے ہیں
منھم رأوا ذکرہ فی فرجھا	کہ اگر چار آدمی گواہی دیں کہ زانی اور زانیہ
مثل المیل فی المکحلۃ رجما	صریحاً زنا کے مرتکب ہوئے تو دونوں رجم
(فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۵۰)	کیے جائیں گے،

ان روایات کے بعد ایک مرتبہ پھر حضرت عمرؓ بن خطاب کی اس روایت پر جو موطا میں مذکور ہے، ایک نظر ڈالیے:

والذی نفسی بیدہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکتبتھا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا البتۃ۔ فانا قد قرأناھا

اسی موطا میں حضرت عمرؓ بن خطاب سے رجم کے بارہ میں ایک روایت اسکے اور آیۃ کے مضمون کی

روایت میں اختلاف ہے، وہ روایت یہ ہے:

(قال) مالک عن ابن شہاب عن	امام مالک ابن شہاب سے اور وہ عبید اللہ بن
عبید اللہ بن عباس قال سمعت	عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے
عمر بن الخطاب یقول الرجم	کہا میں نے عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے
فی کتاب اللہ حق علی من زنی من	سنا ہے کہ رجم کتاب اللہ کی رو سے حق ہے
الرجال والنساء اذا احصن	اس شخص پر جس نے زنا کیا، مرد ہو یا عورت
اذا قامت البینة او کان الحبل	جبکہ وہ محصن ہو اور بینہ قائم ہو جائے یا
او الاعتراف (موطا امام مالک ص ۳۴۹)	حمل ہو یا اعتراف کرے،

اگر رجم کی آیت الشیخ والشیخة ہے تو علی من زنی من الرجال ..... الخ کی تفصیل اس میں کہاں ہے؟ درانحالیکہ دونوں کو حضرت عمرؓ کتاب اللہ فرماتے ہیں، اور دونوں مستند روایتیں ہیں، الشیخ بوڑھا مرد اور الشیخة بوڑھی عورت کی تخصیص میں وہ وسعت کہاں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے معنی دوسری روایت کے مطابق علی من زنی کے لیے جس سے کسی طرح زنا محصن و محصنہ تک ثابت نہیں ہوتا ہے، چہ جائیکہ اتنی تفصیل اس میں آجائے، اگر الشیخ والشیخة کی آیت ہی سے حکم رجم نکلتا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اگر زانی بوڑھا نہیں بلکہ نوجوان ہے یا بوڑھا تو ہے مگر غیر شادی شدہ ہے، تو اس صورت میں بھی رجم ہوگا، حالانکہ غیر محصن کے لیے خواہ وہ بوڑھا ہو یا نوجوان، عورت ہو یا مرد رجم نہیں بلکہ سو کوڑے ہیں، اگر زانی یا زانیہ شادی شدہ ہے تو بغیر اس تخصیص کے کہ وہ بوڑھا ہے، رجم ہوگا، اگر الشیخ والشیخة کو آیت رجم مان لیا جائے تو اس میں اور حضرت عمرؓ کے اس قول علی من زنی میں نقیض ہے اور یہ آیت احکام تورات کے بھی خلاف ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بھی، اس لیے اس کے مقابلہ میں تورات کی اس آیت سے رجم

ثابت کرنا کہیں بہتر ہے، جس پر یہودیوں نے ہاتھ رکھ لیا تھا، اور جس کی خبر جبرئیلؑ اور ابن سلامؓ ذکر دی تھی اس لیے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ کی روایت میں رجم کے بارہ میں آیت توراۃ کا جو حکم اوپر گزر چکا ہے درحقیقت وہی رجم کے توراتی اور اسلامی احکام کے لیے نص ہے،

آیت رجم الشیخ والشیخۃ کی اسی حقیقت کی بنا پر مروان نے جب حضرت زید بن ثابتؓ سے پوچھا،

الا تکتبھا فی المصحف قال لا الا تری ان الشابین الثیبین یرجمان (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۲۷)

کیا اس کو قرآن میں نہیں لکھیں گے؟ انھوں نے جواب دیا نہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ نوجوان مرد اور عورت اگر ثیب ہوں تو رجم کیے جاتے ہیں۔

اس جواب کا مطلب یہ ہوا کہ نوجوان مرد و عورت اگر ثیب ہوں اور زنا کریں تو الشیخ والشیخۃ سے ان کے رجم کا حکم ثابت نہیں ہوتا، بلکہ صرف بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے رجم ثابت ہوتا ہے، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے تھے کہ اس آیت سے حکم رجم ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ جب آپ سے یہ درخواست کی گئی کہ اس آیت کو قرآن میں شامل کر لیں تو فرمایا:

فقال زید سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ فقال عمر لما نزلت اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت اکتبھا فکرہ ھٰذہ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۲۷)

زید بن ثابتؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ الشیخ والشیخۃ ...... الخ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جب یہ آیت اتری تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کو لکھوا دیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا،

یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، ایک یہ کہ "نزل" سے بطور قرآن نازل ہونا ہی مراد نہیں ہے، (اس کی تفصیل آئندہ آئے گی) بلکہ جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے خبر دینا مراد بھی ہے، حضرت عمرؓ نے اس کو قرآن میں لکھوانے کی نہیں، بلکہ قلمبند کرانے کی درخواست کی تھی، دوسری یہ کہ اس سے اس شہرت عام کی تردید ہو جاتی ہے کہ یہ آیت پہلے قرآن میں موجود تھی، اور پھر نکال دی گئی، بلکہ اس روایت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کو ابتدا ہی سے قرآن میں شامل نہیں کیا گیا، بلکہ حضورؐ نے اس کو قلمبند کرنا تک گوارا نہیں فرمایا، چہ جائیکہ اس کو قرآن میں شامل کر لیں اور پھر خارج کر دیں،

اب یہ اشکال رہ جاتا ہے کہ جب الشیخ والشیخۃ ....الخ سے رجم کا حکم ثابت نہیں ہوتا ہے اور وہ قرآن کی تلاوت میں بھی نہیں رہی ہے، اور حضورؐ نے اس کو قلمبند کرنا تک پسند نہیں فرمایا اور زید بن ثابتؓ نے بھی اس کو ایک ناقص آیت مانا ہے، تو پھر موطا کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کا اس قول کے کہ "اگر لوگ اعتراض نہ کرتے تو میں اس کو قرآن میں لکھ دیتا کیونکہ اس کو ہم نے پڑھا ہے۔" کیا معنی ہوں گے؟ خصوصاً ایسی حالت میں اس میں اور حضرت عمرؓ کی دوسری روایت "الرجم حق فی کتاب اللہ علی من زنی ....الخ میں صریح تناقض ہے، اگر حضرت عمرؓ کے اس قول علی من زنی ....الخ کو صحیح تسلیم کر لیں تو پھر حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کہ آیت توراۃ کا مضمون یہ تھا المحصن والمحصنۃ اذا زنیا.... الخ اور حضرت جابرؓ کے اس قول کہ مضمون آیت یوں تھا اذا شھدوا اربعۃ ..... الخ سب کا مطلب ایک ہی ہوگا، اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ عمرؓ بن خطاب کا قول "فی کتاب اللہ حق" سے مراد ہرگز قرآن مجید نہیں ہے، بلکہ بقول علامہ ابن حجر عسقلانی

والمراد بکتاب اللہ ما حکم بہ	کتاب اللہ سے مراد وہ حکم خداوندی ہے جس کا
وکتبہ علی عبادہ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۲۲)	اس نے حکم دیا اور اپنے بندوں پر فرض کیا،

یعنی کتاب اللہ کے معنی وہ امر شرعی ہوں گے جس کا اثبات آیت توراۃ سے ہوتا ہے، اور

جس کا مضمون ابوہریرہؓ اور جابرؓ سے مروی ہے جس کو جبرئیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تھا، اور آپ کے فہم نبوت نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی، حضورؐ کے قول انا اول من احیا کتاب اللہ سے بھی یہی مراد ہے، اور حضرت عمرؓ کے قول سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے،

اس کے بعد الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ کی آیت اوبے مقصد ہو جاتی ہے اور بجائے یہ کہنے کہ یہ آیت منسوخ بالتلاوۃ اور حکماً باقی ہے، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ حکماً بھی منسوخ ہے اور از روئے تلاوت بھی،

مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ روایت موطا میں موجود ہے تو آخر کچھ نہ کچھ اس کی قیمت ہونی چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ نے توراۃ کی آیت رجم کا جو مضمون بیان کیا تھا، وہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہے لفظی ترجمہ نہیں، توراۃ بھی قرآن مجید کی طرح اصولی کتاب ہے، اس لیے ان روایات میں اس حکم کی جو تفصیل اور اس کی جو جزئیات ہیں وہ دراصل تورات کی اصولی آیت کی توضیح اور تشریح ہوگی، جو حضرت موسیٰؑ کی بیان کردہ ہے، تورات اور انجیل کے کاتبوں نے صرف ان ہی آیات کو نقل نہیں کیا جو قرآنی آیات کی طرح جبرئیل کے ذریعہ نازل کی گئی تھیں، بلکہ اس کے ساتھ اپنے نبی کی تفسیر و توضیح کو بھی شامل کر لیا[1]، ابوہریرہؓ

---

[1] اس کی مثال کے لیے خود موجودہ توراۃ کافی ہے، رجم کے سلسلہ کی موجودہ توراتی آیتیں یہاں نقل کیجاتی ہیں، جن سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) جو کوئی اس عورت سے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہے اور فدیہ دی گئی ہے اور نہ آزاد کی گئی ہے ہمبستر ہو، ان کو کوڑے مارے جاویں، وہ مار ڈالے نہ جاویں، اس لیے کہ وہ عورت آزاد نہ تھی۔ (احبار باب ۱۹۔ ۲۰)

(۲) اور وہ شخص جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوس کی جورو سے زنا کرے، وہ زنا کرنے والا اور زنا کرنے والی دونوں قتل کیے جاویں، اور جو شخص کہ اپنے باپ کی جورو سے ہمبستر ہو اس نے آپ کی برہنگی ظاہر کی،

اور جابر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ دونوں روایتوں میں اصل آیتِ توراۃ کی تفسیر و تشریح ہی ہے اور اصل آیت مذکور نہیں، اس لیے اصل آیت کی تلاش ضروری ہے، جو اصولی حیثیت رکھتی تھی، اور منزل من اللہ تھی، تلاش و جستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ ہی اصل آیت توراۃ کا عربی ترجمہ ہے، اوپر ابھی گزر چکا کہ بوڑھا اور بوڑھی مراد لینے سے آیت بالکل بے کار اور بے معنی ہو جاتی ہے، اس حالت میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ آیت توراتی کیسے ہو سکتی ہے جس کے معنی بالکل مہمل ہوں، اس سلسلہ میں امام مالک کی یہ حدیث قابل توجہ ہے

قال مالک قولہ الشیخ والشیخۃ یعنی الثیب والثیبۃ فارجموھما البتۃ — امام مالک نے فرمایا الشیخ والشیخۃ یعنی بوڑھا بوڑھی سے مراد ثیب اور ثیبہ ہے،

الشیخ والشیخۃ کے معنی الثیب والثیبۃ لینے سے اس آیت کی ساری کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں، اور اس میں جان آجاتی ہے، اب یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حضرت عمرؓ کا قول الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی من الرجال والنساء الخ اسی الشیخ والشیخۃ کی تفسیر ہے، عبرانی زبان میں ثیب اور ثیبہ کے لیے جو لفظ موجود تھا، اسی کا ترجمہ الشیخ والشیخۃ کر دیا گیا ہو، اس کی تصدیق امام مالک کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۴) وے دونوں قتل کیے جاویں، اور وہ شخص جو اپنی بہو کے ساتھ ہمبستر ہووے دونوں قتل کیے جاویں۔ (احبار باب ۲۰-۱۱-۱۲-۱۳)

(۳) اور اگر کوئی شخص جورو کو اور اس کی ماں کو بھی رکھے یہ بے حیائی ہے وہ جلائے جاویں، وے اور وہ دونوں تاکہ تمھارے درمیان بے حیائی نہ رہے۔ (احبار۔ ۱۴)

(۴) اگر کسی کاہن کی بیٹی فاحشہ بن کے آپ کو بے حرمت کرے وہ اپنے باپ کو ذلیل کرتی ہے، وہ آگ میں جلائی جائیگی۔ (احبار باب ۲۱-۹)

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہ منزل من اللہ نہیں ہیں، بلکہ اس کی توضیحات اور تفسیرات ہیں، علماء اہل کتاب تورات کی اصل آیت کے ساتھ ہی کے تفسیری و توضیحی ارشادات کو بھی لکھ لیا کرتے تھے، اس لیے انھیں ان آیات میں تحریف کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی،

چند ناسخ و منسوخ آیات

از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مدراسی ندوی

(۳)

"کتاب اللہ" کی طرح لفظ "نزلت" یا اس کے ہم معنی لفظ کے مفہوم کی تحدید سے بھی آیات ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوگئی ہے، نزول کا مقصد محض آیات قرآن ہی کا نزول نہیں ہے، بلکہ وحی کی دوسری قسمیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، مثلاً

فقال عمر لما نزلت اتیت	جب "الشیخ والشیخۃ الخ" کی آیت اتری
النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت	تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا
اکتبنیھا فکانہ کرہ ذلک	اس کو لکھ دیجئے، آپ نے ناپسند فرمایا،

اس روایت میں "نزلت" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے کوئی بات آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی، خواہ وہ قرآنی آیت کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ لوگ "نزلت" کے معنی صرف نزول قرآن کے مراد لیتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ جبرئیل قرآنی آیات کے علاوہ بھی کچھ احکام لایا کرتے تھے، مثلاً رجم کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دینا، حدیثِ احسان میں انسانی شکل میں آنا، شہدائے بیر معونہ کے واقعات بیان کرنا، معراج میں ان کی آمد وغیرہ بیسیوں مثالیں ہیں، یہ ظاہر ہے کہ عربی زبان میں ان سب موقعوں

پر ان کے آنے کو نزول اور ان کے لائے ہوئے احکام کو جو منجانب اللہ ہوا کرتے تھے "نزلت" ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کی مثال بھی لفظ "قراء" کی ہے، جس کے معنی مطلق پڑھنے کے ہیں خواہ کوئی کتاب پڑھیں یا قرآن مجید کی تلاوت کریں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی حضرت جبرئیل آپ کو ہر بات عربی ہی میں بتاتے ہوں گے، قرآن مجید کی آیت سنقرئک فلا تنسیٰ الا ما شاء اللہ کے مطابق ہر قسم کی وحی کے الفاظ خواہ وہ خفی ہو یا جلی آپ کے سینے میں محفوظ ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے وحی خفی (جبرئیل کی بتائی ہوئی وہ باتیں جن کا آیات قرآن سے تعلق نہیں ہوتا تھا) کے نزول کو بھی عربی میں "نزلت" ہی سے تعبیر کیا جائے گا، اور ان احکام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام جو پڑھتے تھے، ان کو قرأ ہی کہا جائے گا۔

وحی جلی اور وحی خفی حکم کے اعتبار سے ایک ہی ہیں لیکن دونوں کی کیفیت میں تھوڑا فرق ہے، اسی بنا پر دونوں کی اہمیت میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔

وحی دو طرح کی ہوتی تھی، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے:

احیاناً یاتینی مثل صلصلة	وحی کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، یہ میرے
الجرس وھو اشد علی فینفصم	لیے بہت سخت ہوتی ہے اور میرے پسینہ
عنی وقد وعیت ما قال واحیانا	نکلنے لگتا ہے، اور وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے،
یتمثل الملک رجلا فیکلمنی فاعی	کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں آتا ہے اور باتیں
ما یقول (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۶)	کرتا ہے، اس کی باتیں یاد کر لیتا ہوں۔

پہلی صورت میں جبرئیل کا نزول آپ کے ادراک بشری پر ہوتا تھا اور اس کی قوت سمع اور قوت بصر کو وحی کا ادراک ہونے لگتا تھا، اور فرشتہ جو کچھ کہتا تھا، وہ خود بخود یاد ہو جاتا تھا۔

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماضی کے صیغہ میں فرمایا "وقد وعیت ما قال" یعنی وہ جو کچھ کہتا تھا وہ مجھے یاد ہو جاتا تھا"، اور دوسری قسم کی وحی مکالمہ کی صورت میں ہوتی تھی، اس کو حضورؐ کوشش کرکے یاد فرماتے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے صیغہ حال "فاعی ما یقول" استعمال فرمایا، یعنی میں اس کو یاد کر لیتا تھا، پہلی وحی قرآن مجید کے لیے خاص ہے جو "وحی جلی" کہلاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ	جلدی یاد کرنے کے لیے زبان نہ ہلایئے، یہ ہمارا
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ	ذمہ ہے کہ اس کو (آپ کے سینے میں) جمع کر دیں،
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ	اور اس کی قرأت کرا دیں، جب ہم اسکی قرأت
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ	کریں تو آپ اسکی اتباع کیجئے، اس کے بعد اسکو
(قیامۃ)	بیان کر دینا ہمارا فرض ہے۔

دوسری وحی عام ہے جو قرآن اور غیر قرآن دونوں پر مشتمل ہے، اور قرآن بھی اس میں شامل ہو سکتا ہے، اس وحی میں فرشتہ جو کچھ کہتا ہے اس کو نبی خود یاد کرتا ہے، اور یہ اس کے اختیار کی چیز ہے، قرآن کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى	ہم عنقریب آپ کو سنائیں گے، آپ نہیں
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (اعلیٰ)	بھولیں گے، مگر جو اللہ چاہے۔

پہلی قسم کی وحی کو جس میں صرف قرآن نازل ہوتا تھا، آپ فوراً کاتبوں کے ذریعہ لکھوا لیتے تھے، لیکن دوسری قسم کی وحی کو فوراً لکھنا ضروری نہیں تھا، اس قسم کی وحی میں قرآنی آیتیں بہت کم نازل ہوتی تھیں، اس لیے ان کے قلمبند کرانے میں جلدی کی ضرورت نہ تھی اور وہ بعد میں لکھوا لی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی قرآن بھی اس وحی میں نازل ہوتا تھا جس کو لکھانے میں تاخیر ہو جاتی تھی، اس تاخیر

بعض لوگوں کو شبہہ ہو گیا کہ یہ وحی آیت قرآنی نہیں ہے، ورنہ آپ ضرور لکھوا دیتے، لیکن جب لکھوا دیا جاتا تو یہ شبہہ جاتا رہتا، اس کی بعض مثالیں حدیث میں بھی ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے:

ان ابن مسعود کان ینکر سورۃ الفاتحۃ والمعوذتین من القرآن	حضرت ابن مسعودؓ اس بات کے سرے منکر تھے کہ سورۂ فاتحہ اور معوذتین قرآنی سورتوں میں سے ہیں۔
(تبیان الجزائری ص ۹۶)	

مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین قرآن میں لکھا ہو کہ ابن مسعودؓ نے اسکی وجہ یہ بتائی کہ

انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بھما	ان کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

اس سے اس واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جس میں یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیدیا تھا، اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اللہ نے یہ دعائیں سکھائیں، چنانچہ اسی سے آپ اس کا علاج کرتے رہے، اسی طرح سورہ فاتحہ بطور دعا آپ کو سکھائی گئی، جس کو آپ نماز اور غیر نماز میں پڑھا کرتے تھے۔

بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں حکم خداوندی سے ان سورتوں کو قرآن میں شامل کر لیا۔

فہرست میں ابن ندیم بھی ایک روایت تبیان کی طرح نقل کرتے ہیں کہ

وکان عبد اللہ بن مسعود لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ ولا فاتحۃ الکتاب	حضرت ابن مسعودؓ (شروع میں) معوذتین کو اپنے صحیفہ میں لکھتے تھے، اور نہ سورۃ فاتحہ کو،

تبیان کی روایت میں بھی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ ان سورتوں کے قرآنی آیت ہونے

کے قائل نہیں تھے اور اس کو دعا یا علاج کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے اس کو صحیفہ میں نہیں لکھا تھا، لیکن جب حضورؐ نے ان کو بھی قرآن کی سورتوں میں شامل کر لیا تو وہ بھی ان کے سورت ہونے کے قائل ہو گئے، اور اپنے صحیفہ میں لکھ لیا، چنانچہ فضل بن شاذ فرماتے ہیں:

وقال رأيت مصحفا قد كتب	میں نے (ابن مسعودؓ) کا ایک صحیفہ دیکھا
منذ نحو مأتين سنة فيه	جو دو سو سال قدیم تھا، اس میں سورۂ
فاتحة الكتاب (فہرست ابن ندیم)	فاتحہ تھا،

پہلے ان کے صحیفہ میں تینوں سورتیں نہیں تھیں، اور بعد کے صحیفہ میں جب انھوں نے سورۂ فاتحہ کو شامل کر لیا تو معوذتین کا شامل کرنا بھی ضروری تھا، فضل بن شاذ نے غالباً صحیفہ کا پہلا حصہ دیکھا تھا اور آخر کا حصہ نہیں دیکھا تھا،

یہ آیتیں شروع میں وحی خفی کے ذریعہ معلوم ہوتی تھیں، اس کے بعد وحی جلی میں شامل کی گئیں، اس سے ان کے قرآنی سورۃ ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا، اس لیے کہ یہ بھی جبرئیل کے ذریعہ معلوم ہوا تھا، اگر کوئی فرق تھا تو وہ "دعیت" اور "اعی" یعنی حفظ کے طریقہ کا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی،

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ بیر معونہ میں بہت سے صحابہ دھوکے سے شہید کر دیے گئے تو اس کی خبر حضرت جبرئیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں دی

انهم لقوا ربهم فرضى عنهم	وہ اپنے رب سے مل گئے، اللہ ان سے
وارضاهم (بخاری جلد اص ۲۹۳)	راضی ہو گیا اور ان کو راضی کر دیا۔

ان صحابہ نے شہادت کے وقت ایک دعا کی تھی، جس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھی، حضرت جبرئیلؑ نے یہ بھی خبر آکر سنائی، اور اس دعا کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

اللھم ابلغ منا بینا انا قد لقینا	اے اللہ ہمارے نبی کو یہ خبر پہنچا دے کہ ہم اپنے
فرضینا عنک و رضیت عنا	پروردگار سے مل گئے اور ہم آپ سے راضی تھے
(بخاری ج ۲ ص ۵۸۶)	اور آپ بھی ہم سے راضی تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان شہداء نے ایسے خلوص و محبت اور عشق و وارفتگی کے جذبہ سے یہ دعا کی تھی کہ دوسرے عاشقان رسول نے بھی اس دعا کو اپنے لیے وظیفہ اور ورد بنا لیا تھا، اور ایک مدت تک اس کو قرآن کی طرح پڑھنے کا معمول رہا، ایک مدت بعد خود سے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ترک کر دیا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

فقرأنا فیھم قرآنا ثم ان ذلک	ہم نے اس دعا کو ان کی شان میں (ایا دمیں)
رفع (بخاری ج ۲ ص ۵۸۶)	قرآن کی طرح ورد بنا لیا تھا پھر اسکو ترک کر دیا گیا

اس روایت میں ترک کے لیے "رفع" استعمال کیا ہے، اور دوسری جگہ حضرت انسؓ ہی نے اسکو منسوخ سے تعبیر کیا ہے "ثم کان من المنسوخ" یعنی یہ حکم منسوخ ہو گیا،

مسٹر برق نے اس آیت کو توڑ مروڑ کر، عربی کی اصل عبارت حذف کر کے بڑی خیانت سے کام لیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: "حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ان لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی:

بلغوا قومنا انا قد لقینا ربنا فرضی	ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے پروردگار سے
عنا و رضینا عنہ	مل گئے، وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے

اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کا باقی رہنا ضروری تھا، قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں جو بعینہ محفوظ ہیں اور ان میں سے ایک حرف بھی منسوخ نہیں ہوا، اس آیت میں کیا خاص بات تھی کہ پہلے اتری اور پھر منسوخ کر دی گئی۔" (دو اسلام ص ۱۷۱)

اوپر کی تفصیل کی روشنی میں اس بیان کی حقیقت بالکل ظاہر ہو جاتی ہے،

تیسری چیز جس کی وجہ سے آیت ناسخ و منسوخ کے سمجھنے میں وقت ہوتی ہے وہ لفظ "الکتاب" ہے، کتاب اللہ کی طرح اسکے معنی بھی وسیع ہیں، اس کے صرف وہی معنی مراد نہیں ہیں جو فقہا نے لیے ہیں،

لوگوں نے عام طور پر یہ غلطی کی ہے کہ کتب احادیث کے مطالعہ کے وقت ہر جگہ کتاب اللہ "الکتاب" اور "منزلت" سے مراد قرآن ہی لیا ہے، اسی طرح جہاں "نسخ" یا "رفع" کا لفظ آیا ہے اس سے آیات قرآنی کا نسخ سمجھ لیا جو صحیح نہیں ہے،

اس سلسلہ میں کتاب اور صحیفہ کے لفظوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے مراد کیا ہے، بہت سی احادیث میں کتاب اور صحیفہ کاپی (Note book) اور رکارڈ بک (Record book) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد صحابہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سب کے پاس صحیفے ہوا کرتے تھے، خواہ اس کے اوراق کاغذ کے ہوں یا پتیوں کے یا ہڈیوں اور چمڑے کے، ان الفاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ صحیفے یا اوراق محض ہڈی چمڑے یا پتیوں کا غیر مرتب انبار ہوتے تھے، بلکہ آجکل کی ڈیتی کی طرح یہ چیزیں مرتب ہوتی تھیں، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے تدوین قرآن میں اسکی پوری تفصیل لکھی ہے:

اس زمانہ میں ہوتا یہ تھا کہ صحابہ تمام قابل تحریر باتوں کو بغیر کسی منطقی ترتیب اور تقسیم کے ایک ہی صحیفہ یا کتاب میں لکھ لیا کرتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں قرآن مجید کی جو آیتیں نازل ہوتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ان آیات کی جو تفسیر و تشریح فرماتے تھے ان کو بھی اسی طرح لکھ لیتے تھے، احکام بیان کرتے تو ان کو بھی ضبط تحریر میں لے آتے تھے، ان سب کو الگ الگ اوراق یا علیحدہ علیحدہ ابواب میں نہیں لکھتے تھے، بلکہ سب کو بغیر کسی تمیز و تفریق کے ایک ہی جگہ لکھ لیتے تھے، کیونکہ اس دور کا طرز تصنیف ہی ایسا ہوتا تھا، اس کی بہترین مثال

شعراء جاہلی کا کلام ہے، عربی تہذیب و تمدن اور سیاست و معاشرت کے اظہار کا ذریعہ شاعری ہی تھا، نثر نگاری کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا، اس لیے کہ نثر کا عروج تہذیب و تمدن کے شباب میں ہوتا ہے جیسا کہ دور عباسی میں ہوا، مثلاً باب النسیب میں شاعر پہلے سوز و گداز کا اظہار کر رہا ہے کہ یکایک اس سلسلہ میں کوئی سفر یاد آگیا تو اس کا ذکر شروع کر دیگا، مثلاً اگر گھوڑے پر سوار جا رہا تھا تو گھوڑے کے اوصاف بیان کر دے گا، اس لیے شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں نظام آیات قرآن کو بھی اسی پر مبنی کیا ہے،

صحابہ کے ابتدائی دور میں بعض صحابہ کے پاس ایک صحیفہ یادداشت ہوتی، جس میں وہ قرآن کے علاوہ اس کی تفسیر، احکام اور مسائل بھی لکھ لیتے تھے، لیکن چونکہ قرآن عام صحابہ کے حافظہ میں بھی محفوظ تھا، اور اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اس لیے وہ یہ فرق آسانی سے کر لیتے تھے کہ ان میں کون حصہ قرآن کا ہے اور کون حصہ تفسیر کا، کون جزء آپ کے ارشاد پر مبنی ہے اور کون عہد ناموں پر مشتمل ہے، البتہ کاتبین وحی کے پاس جو آپ کی نگرانی میں قرآن لکھتے تھے، ان کے پاس خالص قرآن کے صحیفے اور مجموعے موجود تھے،

صحابہ کسی قرآنی آیت کو ایک صحیفہ سے دوسرے صحیفہ یا ایک سورت سے ہٹا کر دوسری سورت میں کر دیتے تو اس کو بھی نسخ کہا جاتا تھا، مثلاً بخاری کی ایک لمبی حدیث میں ہے:

فارسل عثمان الی حفصة	حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس ایک
ان ارسلی الینا الصحف ننسخها	آدمی بھیجا کہ وہ قرآن کا محفوظ نسخہ بھیجیں تاکہ
فی المصاحف ثم نردها الیک	اسکی نقل لیکر واپس کر دیا جائے....
...... وعبد الرحمن بن	....اور عبد الرحمن بن حارث بن ہشام کو
الحارث ابن هشام ننسخوها	نقل کرنے کا حکم دیا، ان لوگوں نے کئی

فی المصاحف ...... اذا نسخوا
الصحف فی المصاحف رد عثمان
الصحف الی حفصة وارسل
الی کل افق بمصحف مما نسخوا

کاپیوں میں اس کو نقل کیا، نقلیں کرانے کے
بعد حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کو انکا
نسخہ واپس کردیا اور ان نقلوں کو ملک
کے مختلف حصوں میں بھیجدیا

(تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۰۸)

اس حدیث میں "نسخ" نقل (کاپی Copy) کے معنی میں ہے، اس سے ہرگز منسوخ ہونا مراد نہیں، اس نسخ سے بھی منکرین حدیث کو دھوکا ہوجاتا ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی ناسخ و منسوخ ہے،

مختلف چیزوں کو ایک ساتھ لکھنے کا طریقہ کچھ دنوں تک جاری رہا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے اس خطرہ سے منع فرمایا کہ مبادا اس سے کلام مجید اور دوسری چیزیں خلط ملط نہ ہوجائیں، چنانچہ حدیث میں ہے:

کنا نکتب ما نسمع من النبی صلی اللہ
علیہ وسلم فخرج علینا فقال ماذا
تکتبون، فقلنا ما نسمع منک، فقال أکتاب
مع کتاب اللہ امحضوا .... کتاب اللہ
واخلصوه قال فجمعنا ما کتبناه
فی صعید واحد ثم احرقناه
....
(تدوین حدیث از مناظر احسن گیلانی ص ۲۴۹
بحوالہ مجمع الزوائد)

ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے
لکھ لیا کرتے تھے، ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ہمارے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا
لکھ رہے ہو، ہم نے عرض کیا جو کچھ آپ کی زبان
سے سنتے ہیں، فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور
کتاب بھی لکھتے ہو، کتاب اللہ کو الگ کردو اور مخصوص
کردو (یعنی حدیث اور دوسری چیزیں اسکے ساتھ
نہ لکھو) اس حکم کے بعد ہم نے قرآن کے ساتھ جو اور چیزیں
لکھی تھیں انھیں علیحدہ لکھ لیا اور اس مخلوط کتاب کو جلا دیا۔

اس حدیث میں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو دیا جو اس وقت آپ کی خدمت میں موجود تھے، سب صحابہ اس وقت نہ رہے ہوں گے، یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ کی ہر بات کو قلمبند کرنے والے بے شمار صحابہ تھے جو سب اس وقت موجود نہ رہے ہوں گے، اس لیے اس مخلوط مجموعے کے جلانے سے یہ شبہہ نہ ہو کہ سب صحابہ نے جلا ڈالا ہوگا، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلانے کا حکم نہیں فرمایا تھا، بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ قرآن اور غیر قرآن دونوں الگ الگ کتاب میں لکھے جائیں تاکہ خلط ملط نہ ہو جائیں، جن لوگوں نے جلا دیا وہ انکا ذاتی فعل تھا، حضورؐ کا منشا ہرگز جلانے کا نہ تھا، مسٹر برق نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کے مٹا دینے کا حکم دیا تھا، اور وہ چیزیں جلا دی گئی تھیں، اس کے باوجود احادیث کا ایک انبار جمع ہو گیا،

قرآن مجید ایک یا چند آیتوں کی شکل میں نازل ہوتا تھا، سورتوں کی تشکیل اس وقت ہوتی تھی جب آیات کا کافی حصہ جمع ہو جاتا تھا، قرآن کی موجودہ آیاتی اور سورتی تقسیم شروع ہی میں نہیں تھی، اس کی ترتیب اس طرح ہوتی تھی کہ جب چند آیتیں نازل ہوتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ان کو فلاں جگہ اور فلاں آیت کے ساتھ ملا دیا جائے، جب پھر مزید آیتیں نازل ہوتیں تو فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ کر دیا جائے اور ان آیتوں کو دوسری آیتوں کے ساتھ ملا دیا جائے، اس طرح آیتوں کے کئی کئی مجموعے ہو جاتے تھے، اور ہر ایک مجموعہ ایک ایک سورت کہلاتا تھا، پھر ان کی ترتیب میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا، مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ الفرقان، اور سورۂ بنی اسرائیل جب مکمل نہیں ہوئی تھیں، بلکہ ان کا نام بھی نہیں رکھا گیا تھا، اس وقت اگر دس آیتیں نازل ہوئیں تو ان میں سے پانچ معنوی مناسبت سے بقرہ میں لکھ دیجاتیں اور بقرہ کی چند آیات ہٹا کر مثلاً الفرقان میں کر لیجاتیں اور باقی پانچ آیتوں

کو الفرقان کی آیات میں شامل کر دیا جاتا، جب مزید آیتیں نازل ہوئیں تو اسی طریقہ سے رد و بدل ہوتا رہتا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک قرآن کا نزول ختم نہیں ہوا، یہ رد و بدل حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی جلی یا وحی خفی یا خود اپنے اجتہاد سے کرتے تھے،

تیئیس سال تک جو تغیرات ہوتے رہے، ان میں سے ہر ایک سال کو ایک میقات کہنا چاہیے، ہر میقات کی انتہا رمضان پر ہوتی تھی، حدیث میں آتا ہے کہ جبرئیل ہر رمضان میں سال بھر یعنی اس میقات کی آیتوں کو بالترتیب سناتے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب منشائے الٰہی کے مطابق ہوتی تھی،

مذکورۂ بالا بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترتیب میں جو رد و بدل فرماتے تھے، اس کو بھی عربی میں نسخ کہا جائے گا، چنانچہ قرآن مجید کے صحیفوں میں اس معنی میں بھی ناسخ و منسوخ کا استعمال ہوا ہے، اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی،

قرآن مجید کی ترتیب کے اس رد و بدل کا سرسید احمد خاں نے بھی بیان کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> قرآن مجید یا اسکی آیتیں ایک وقت میں نازل نہیں ہوتی تھیں بلکہ کوئی آیت کسی سورت کے وقت میں اور کوئی آیت کسی وقت میں نازل ہوئی تھی، ایک سورت ابھی ختم ہونے نہیں پاتی تھی کہ دوسری آیت نازل ہونی شروع ہوئی، اور ایسی چند آیتیں نازل ہوئیں جن کا مضمون ان سورتوں کی آیتوں سے جو پہلے نازل ہو چکی تھیں محض مختلف تھا، اور یہ سورت بھی نامکمل رہ کر ایک اور سورت نازل ہونی شروع ہو گئی اور اسی طرح سلسلہ جاری رہا، تمام آیتیں جس طرح نازل ہوئیں علیحدہ علیحدہ چمڑوں کے ٹکڑوں پر اور بے ترتیبی سے لکھی ہوئی رہیں، اگرچہ پیغمبر خدا نے تمام آیتوں اور سورتوں

کی ترتیب لوگوں کو بتا دی تھی، ان سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا، اسی سبب سے آیتوں کو ترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا، بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں، (خطبات احمدیہ ص ۴۲۹)

مختلف صحابہ کے نسخے مختلف تھے، کسی کے پاس مکمل قرآن نہیں تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کی کوشش سے قرآن مجید کو آخری ترتیب کے مطابق سرکاری طور پر جمع کر دیا گیا، اور حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں اس سرکاری نسخے کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں، اور یہ حکم جاری کر دیا کہ بقیہ میقاتی ترتیبوں کو ضائع کر دیا جائے اور صرف آخری ترتیب کو باقی رکھا جائے اور اسی کے مطابق پڑھا جائے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جو ترتیب بدلتے رہتے تھے، بعض صحابہ کرام کو جو دور دراز کے شہروں میں رہا کرتے تھے، اسکی اطلاع نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں، کتنے ایسے صحابہ ہیں کہ حضور پر ایمان لانے کے بعد کچھ دن آپ کی صحبت میں رہے اور نماز وغیرہ کے ضروری مسائل سیکھ کر اپنے اپنے مقام پر واپس چلے گئے یا کہیں بھیج دیے گئے، یہ لوگ اسی طریقہ سے نماز پڑھتے رہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی، درمیان میں اس کے احکام میں جو جزوی تبدیلی ہوتی تھی، اس کی ان کو خبر نہ ہونے پاتی تھی، اس کی مثال کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ مدینہ آئے اور نماز میں شریک ہو گئے، اس وقت تک ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ نماز میں بات کرنا حرام ہے، اس لیے انھوں نے کچھ بات کی، نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سمجھایا کہ نماز میں سلام و کلام صحیح نہیں، جب نماز تک کا یہ حال تھا تو قرآنی آیات میں ترمیم کی خبر نہ پہنچنا کوئی حیرت کی بات نہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض دور دراز کے لوگوں کو خلافت راشدہ ہی نہیں بلکہ حجاج بن یوسف کے زمانہ تک آخری ترتیب کی اطلاع نہیں تھی، ایک

حدیث میں ہے کہ

عن الاعمش قال سمعت الحجاج
بن یوسف یقول وھو یخطب
علی المنبر الفوا القرآن کما الفه
جبرئیل السورة التی یذکر فیھا
النساء والسورة التی یذکر فیھا
آل عمران فلقیت ابراھیم فاخبرته
بقوله فسبه

اعمش فرماتے ہیں، میں نے حجاج بن یوسف کو
منبر پر تقریر کرتے ہوئے سنا کہ لوگو! قرآن کو
اسی طرح ترتیب دو جس طرح جبرئیل نے
ترتیب دی تھی، وہ سورتیں جو بقرہ، نساء
اور آل عمران کہلاتی ہیں، میں نے ابراہیم کو
یہ بات سنائی تو انھوں نے حجاج
کو برا بھلا کہا،

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو یہ شبہہ ہو گیا تھا کہ حجاج سورتوں کی ترتیب بدلنا چاہتا ہے اور آل عمران کو نساء کے بعد کر دینا چاہتا ہے، حالانکہ یہ بات نہ تھی، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مصحف عثمانی میں جو ترتیب ہے، دوسرے مصاحف کو بھی اسی کے مطابق مرتب کیا جائے اور پرانی میقاتی ترتیب ترک کر دی جائے، جو جبرئیل کی آخری بیان کردہ ترتیب کے خلاف ہے اور جس کو حضرت عثمانؓ نے ضائع کر دینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اسی حدیث کی شرح میں امام نووی تحریر فرماتے ہیں:

قال القاضی وتقدیمه ھنا
النساء علی آل عمران دلیل علی
انه لم یرد الا نظم الآی لان
الحجاج انما کان یتبع مصحف
عثمان رضی اللہ عنه ولا یخالفه

قاضی نے کہا کہ حجاج کا النساء کو آل عمران
پر مقدم کر دینا اس بات کی دلیل ہو کہ اس سے
اس کی مراد صرف نظم آیات تھی، اس لیے کہ حجاج
مصحف عثمانی کا پیرو تھا، اس کا مخالف نہ تھا،
... بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

والظاهر انه اراد ترتیب السور	سورتوں کی ترتیب مراد لی تھی ،

(شرح مسلم جلد اول ص ۱۹۴)

اس دوسری ترتیب (میقاتی ترتیب) کے نسخوں کی چند مثالیں ابن ندیم نے بھی لکھی ہیں، ایک جگہ نزول آیات کی مقدار بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اول ما نزل من القرآن علی النبی	حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی پہلی آیت جو
صلی اللہ علیہ وسلم اقرء باسم	نازل ہوئی وہ اقرء باسم ربك سے علم الانسان
ربك الذی خلق الی علم الانسان	ما لم یعلم تک، پھر سورۂ نون و القلم
ما لم یعلم۔ ثم نون والقلم ثم	نازل ہوئی، اسکے بعد یا ایہا المزمل کی ابتدائی
یا ایہا المزمل و آخرها بطریق	آیتیں، اس کی بقیہ آیتیں سفر مکہ کے راستہ
مکة الخ (فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۳۷)	میں اتریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن ندیم کو صرف سورۂ اقرء اور یا ایہا المزمل کی آیات کی نزول کی کیفیت اور کیفیت معلوم تھی، جو اس نے بیان کر دی، دوسری سورتوں کے متعلق غالباً علم نہیں تھا، اور یہ ہے بھی نہایت مشکل چیز، ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نزول آیات کے بعد اس کی کچھ مقدار مختلف سورتوں کے لیے متعین فرما دیتے، اس کے بعد ان کے نزول کی مقدار جس قدر بڑھتی جاتی منشاے الٰہی کے مطابق اس کو اسی طرح مختلف سورتوں میں تقسیم فرماتے جاتے، اور آخری میقات کی ترتیب تک ردو بدل کا یہ سلسلہ جاری رہا، اس ردو بدل کو بھی عربی لغت میں نسخ کہتے ہیں، اس لیے اس نسخ سے بہتوں کو غلط فہمی پیدا ہوگئی، حدیثوں میں آتا ہے کہ بعض صحابی نے قرآن کی آیتوں کو موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھا تو لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ پہلے یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں، پھر منسوخ ہوگئیں، یا موجودہ آیتیں پھر نازل ہوئیں، حالانکہ اس سے مراد

صرف یہ ہے کہ ان صحابہ نے کسی ایسے میقات کے صحیفہ سے پڑھا ہوگا جو آخری میقات کے صحیفہ کے علاوہ تھا،

ابن ندیم نے ایسے صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے جنھوں نے قرآن کی مختلف میقاتوں کی ترتیب کو محفوظ کیا تھا، مثلاً علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہ، سعد بن عبید بن النعمان بن عمرو بن زید رضی اللہ عنہ، ابو الدرداء عویمر بن زید رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل اوس رضی اللہ عنہ، ابو زید ثابت ابن زید بن النعمان، ابی بن کعب بن قیس بن مالک بن امرء القیس، عبید بن معاویہ بن زید بن ثابت ابن ضحاک وغیرہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود کی ترتیب یہ تھی:

البقرۃ، النساء، آل عمران، المص، الانعام، المائدہ، یونس، براءۃ، النحل، ہود، یوسف، بنی اسرائیل، الانبیاء، المومنون، الشعراء........ الخ

اور ابی بن کعب کی یہ تھی:

فاتحۃ الکتاب، البقرۃ، النساء، آل عمران، الانعام، الاعراف، المائدہ الذی التبسہ وہی یونس، الانفال، التوبہ، ہود، مریم، الشعراء........ الخ (فہرست ابن ندیم ص ۴۴)

ان دو مثالوں سے مختلف میقاتی ترتیب کا اندازہ ہو گیا ہوگا، اسی پر بقیہ میقاتوں کی ترتیبوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے،

مذکورہ عبارت میں ابن ندیم کے اس قول سے کہ "المائدۃ الذی التبسہ وھی یونس" یعنی مائدہ میں ابی بن کعب کو التباس ہوگیا تھا جو درحقیقت سورۂ یونس تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعب کے نسخہ میں مائدہ میں یونس کی بھی بہت سی آیتیں شامل تھیں، جو کسی میقاتی ترتیب میں رہا ہوگا، اور بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کو مائدہ سے ہٹا کر یونس میں کر دیا ہوگا، اس لیے ابن ندیم کا یہ کہنا کہ ابی بن کعب کو التباس ہوگیا، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ابن ندیم نے

موجودہ ترتیب کو پیش نظر رکھکر یہ بات کہی ہے، حالانکہ ابی بن کعب کا نسخہ موجودہ ترتیب پر تھا ہی نہیں،
اگر تاریخ یا حدیث کی کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی راوی نے موجودہ پاروں یا
موجودہ سورتوں سے زیادہ یا کم کچھ بیان کیا ہے تو اس سے بھی ناسخ و منسوخ کا شبہہ ہو جاتا ہے
اور بعض فرقے اس سے یہ غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاذ اللہ صحابہ نے قرآن کا کچھ
حصہ حذف کر دیا، پاروں کا شمار تو متاخرین کا ہے جو سہولت کے لیے اختیار کر لیا گیا، اس کو کسی
اور ترتیب سے تیس کے بجائے چالیس بھی بنایا جاسکتا ہے، اس کی حیثیت ابواب (chapters)
سے زیادہ نہیں ہے، اسی طرح سورتوں کے نام کا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بدلتے
رہنا کوئی تعجب نہیں،

مذکورۂ بالا بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک قرآن مجید کی تدوین کے
تین طریقے رہے، ایک تو مخلوط مجموعہ جس میں قرآن کے علاوہ حدیث، تفسیر، فقہ سب چیزیں ہوتی
تھیں، اس کی حیثیت گویا دائرۃ المعارف کی سی تھی، دوسرا طریقہ میقاتی ترتیب کا تھا، اور
تیسرا آخری ترتیب جس کو حضرت عثمانؓ نے رائج کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
بعد ایک نئی ترتیب کا آغاز ہوا، سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے علمی ذہن و فکر رکھنے والے
صحابی کو یہ خیال ہوا کہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کو ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کیا جائے،
چنانچہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہی یہ کام شروع کر دیا، حدیث میں آتا ہے کہ

عن محمد قال نبئت ان علیا	محمد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ حضرت علیؓ نے
ابطأ عن بیعة ابی بکر، فلقیه	حضرت ابو بکرؓ سے بیعت کرنے میں تاخیر کی تو
ابو بکر فقال اکرهت امارتی	حضرت ابو بکرؓ ان سے ملے اور پوچھا کیا تم میری
فقال لا ولکن آلیت بیمین	امارت کو ناپسند کرتے ہو، انھوں نے جواب دیا

ان لا ارتدی بردائی الا الی	نہیں یہ بات نہیں، بلکہ میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ
الصلوٰۃ حتی اجمع القرآن	جب تک قرآن نہ جمع کر لوں، اس وقت تک
	صرف نماز کے لیے چادر اوڑھوں گا۔

اس حدیث پر محمد بن سیرین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ

فزعموا انہ کتبہ علی تنزیلہ	لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے شان نزول
طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۱ مطبوعہ یورپ	کے مطابق اس کو مرتب کیا۔

خدا معلوم اس جمع قرآن کا مقصد اور پس منظر حضرت علیؓ کے ذہن میں کیا تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خیال کیا کہ اس ترتیب سے آیات کے مطلب سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور شان نزول پیش نظر رہنے سے مشکلاتِ قرآن کی بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی، اور نزول قرآن کی مرتب تاریخ سامنے آجائے گی، جو اس عہد کی تاریخ مرتب کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگی، حضرت علیؓ کا یہ کام اس حیثیت سے بہت مفید اور آئندہ قرآن مجید پر کام کرنے والوں کے لیے عمدہ نمونہ تھا،

حیرت کی بات ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ عظیم الشان کام محض اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے کیا جس سے عربوں کی قوتِ حافظہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ

عن علی علیہ السلام انہ رای	حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ حضور
من الناس طیرۃ عند وفاۃ النبی	صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لوگوں نے بدفالی مراد لی ہے، اس لیے
صلی اللہ علیہ وسلم، فاقسم انہ	انھوں نے قسم کھالی کہ قرآن جمع کرکے ہی چادر اوڑھیں گے
لا یضع رداءہ حتی یجمع القرآن	اور اپنے حافظہ سے یہ قرآن جمع کیا (ابن
فھو اول مصحف عند اھل جعفر	ندیم کہتے ہیں) میں نے حضرت علیؓ کے خط کا لکھا ہوا

ورأیت انا فی زماننا عند ابی	یہ قرآن اپنے زمانہ میں ابویعلی حمزۃ الحسن رحمہ اللہ
یعلی حمزۃ الحسن رحمہ اللہ	کے پاس دیکھا ہے، اس کے بہت سے اوراق نکل چکے
مصحفاقد سقط منہ اوراق	تھے جو بنی ہاشم میں متوارث چلا آرہا تھا، اسکی
بخط علی بن ابی طالب یتوارثہ	ترتیب سوری یہ تھی (یعنی ابی بن کعبؓ
بنو حسن علی مر الزمان وھذا	اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی طرح کی
ترتیب السور من ذلک المصحف۔ (الفہرست ابن ندیم ص ۲۸)	جو گذر چکی)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے اس صحیفہ کی ترتیب سوری ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصحف سے ملتی جلتی تھی، اور خود ان دونوں بزرگوں کی ترتیب میں بھی میقات میں فرق ہونے کی وجہ سے کافی اختلاف تھا، اگر حضرت علیؓ کی ترتیب ان دونوں کے مشابہ تھی تو ضرور اس کی ایک جداگانہ شکل رہی ہوگی،

ابن ندیم کے قول "جمع فیہ القرآن من قلبہ" یعنی اپنے حافظہ سے جمع کیا، اور ابن سعد کی روایت "علی تنزیلہ" دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ قرآن آیات کی ترتیب نزولی کے مطابق تھا، اور یہ ترتیب حضرت علیؓ نے اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے دی تھی، دوسری بات یہ کہ ابن ندیم کے اس قول سے جو خود شیعیت کی طرف مائل تھے، شیعوں کا سارا مفروضہ باطل ہوجاتا ہے کہ حضرت علیؓ کو خاص خاص آیتیں ملی تھیں، جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں اور ان کا قرآن موجودہ قرآن سے جداگانہ تھا،

صحابۂ کرامؓ پر ان کا سارا افترا، اور بہتان دور ہوجاتا ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین قرآن میں علامہ طبرسی شیعی کا مشہور قول نقل کیا ہے کہ

الزیادۃ فی القرآن مجموع علیہ	قرآن میں زیادتی بالاتفاق باطل ہے، البتہ

علی بطلانه، واما النقصان — کمی کا خیال عوام کے ایک طبقہ میں ضرور پایا جاتا ہے

فقد روی عن قوم من حشویة — لیکن صحیح قول اس کے خلاف ہے،

العامة والصحیح خلاف ذلک (تفسیر طبرسی ص ۶۰)

بلاشبہ حضرت علیؓ کا یہ اقدام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دور صدیقی کا پہلا علمی کارنامہ ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورہ سے جو کام انجام دیا اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ہوئی، اس کی حیثیت سرکاری تھی، حالانکہ اسکی ترتیب عہد رسالت میں ہو چکی تھی، البتہ کتابی شکل میں مدون نہ ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے اسکو کتابی شکل میں کر دیا، امام سیوطی نفہ السنن میں لکھتے ہیں:

کتابة القرآن لیست بمحدثة	قرآن کی کتابت (تدوین) کوئی نئی چیز نہ تھی
فانه صلی الله علیه وسلم کان	خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکو لکھوا دیتے تھے،
یامر بکتابته ولکنه کان مفرقا	لیکن وہ مختلف پرزوں، ہڈیوں میں اور
فی الرقاع والاکتاف والعسب	کھجور کی تیلیوں میں لکھا ہوا منتشر تھا، حضرت
وانما امر الصدیق بنسخها من	ابوبکرؓ نے اس کو ایک جگہ کتابی صورت
مکان الی مکان مجتمعا	میں مدون کرا دیا،

(اتقان ج ۱ … ص ۶۰)

یعنی حضرت ابوبکرؓ نے قرآن پاک کی کوئی نئی ترتیب نہیں کرائی بلکہ عہد رسالت میں جو ترتیب ہو چکی تھی، اور اس کے اجزاء مختلف چیزوں میں لکھے ہوئے تھے، ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے کتابی صورت میں کرا دیا، اور حضرت عثمانؓ نے اس کی نقلیں کرا کے سارے اسلامی ملکوں میں بھجوا دیں، اور اس کے علاوہ قرآن کی جو میقاتی ترتیبیں تھیں انھیں ضائع کرا دیا،

قرآن مجید کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ نے بھی ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جن آیاتِ قرآنی کی تشریح فرمائی تھی، ایک مصحف میں انکو جمع اور مرتب کرنے کا حکم دیا، ایک روایت میں ہے:

عن ابی یونس مولیٰ عائشۃ قالت	حضرت عائشہؓ کے خادم ابو یونس بیان کرتے ہیں کہ
ان اکتب لہا مصحفا وقالت اذا	حضرت عائشہؓ نے مجھکو ایک صحیفہ لکھنے کا حکم دیا
بلغت ھذہ الآیۃ فاذنی حافظوا	اور فرمایا کہ جب اس آیت حافظوا..... الخ
علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ	پر پہنچو تو مجھے بتانا، چنانچہ جب میں اس آیت پر
فلما بلغتہا آذنتہا فاملت علیّ	پہنچا تو انھیں اطلاع دی، انھوں نے اسکی
حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ	تفسیر میں لکھوایا کہ نمازوں کی حفاظت کرو خاصکر
الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر وقوموا	درمیان کی نماز یعنی عصر کی، اور فرمانبرداری
للہ قانتین۔ ثم قالت سمعتہا من	بجالاتے ہوئے اسکے سامنے کھڑے ہوجاؤ،
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد ج ا ص ۵۹)	پھر فرمایا میں نے اس (تفسیر) کو رسول اللہؐ سے سنا ہے،

اس حدیث سے یہ شبہہ نہ ہو کہ پورے قرآن میں صرف صلوٰۃ العصر ہی کی تفسیر لکھوائی، بلکہ ابو یونسؓ نے یہ واقعہ کسی ایسے موقع پر بیان کیا ہوگا جب اس سلسلہ میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہوگا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے کونسی نماز مراد ہے، ورنہ اسی طریقہ سے اس مصحف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ تمام تفسیریں جمع کردیگئی تھیں، یہ کہنا چاہیے کہ انکی یہ تفسیر آئندہ تفاسیر کے لیے ایک نمونہ تھی، اسکی تقلید میں دوسری ازواج مطہراتؓ کو بھی شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی اسی قسم کا مصحف مرتب کرائیں، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت حفصہؓ نے بھی اسی قسم کا ایک بانفسیر مصحف مرتب کیا تھا۔

عن عمر بن نافع انہ قال کنت اکتب مصحفا حفصۃ	عمرو بن نافع کی روایت ہے کہ میں ام المومنین حضرت حفصہؓ کے لیے
ام المومنین فقالت اذا بلغت ھذہ الآیۃ فآذنی	ایک صحیفہ لکھ رہا تھا، انھوں نے فرمایا کہ جب اس آیت پر
حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قانتین	پہنچو حافظوا..... الخ تو مجھے خبر کرنا، چنانچہ جب میں اس
فلما بلغتہا آذنتہا۔ فاملت علی حافظوا علی الصلوٰۃ	آیت پر پہنچا تو انھیں خبر کی، انھوں نے لکھوایا کہ حافظوا علی الصلوٰۃ
والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر وقوموا للہ قانتین۔ (موطا امام مالک ص ۵۹)	والصلوٰۃ الوسطیٰ وصلوٰۃ العصر وقوموا للہ قانتین